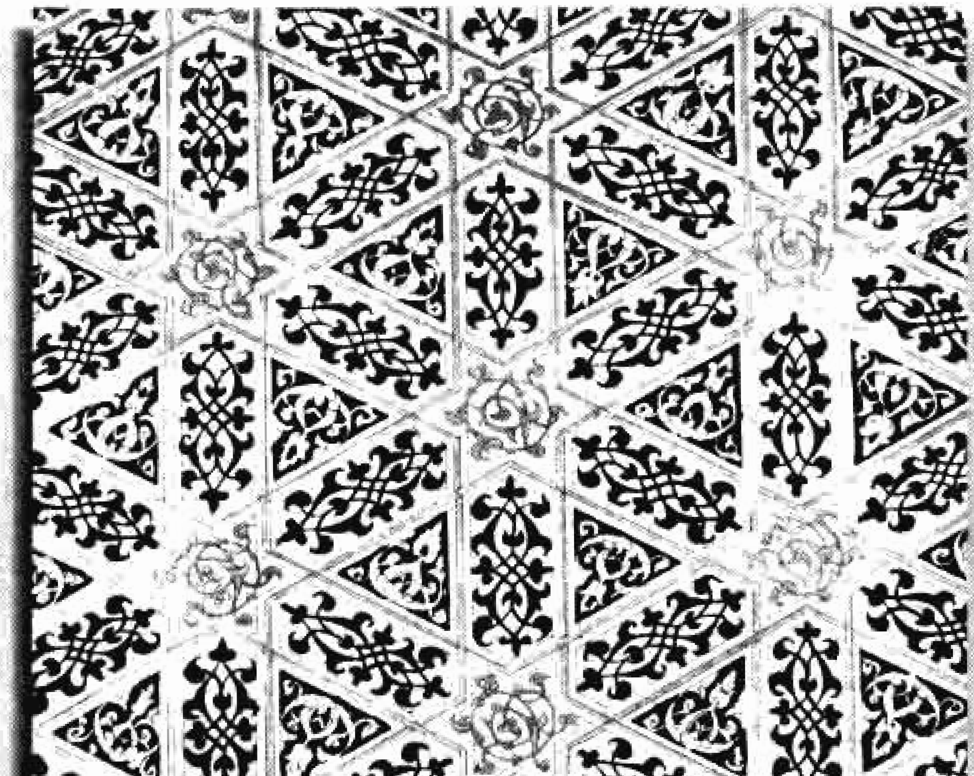
ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱۹۹۸ء

مُدیر
خورشید احمد



ادارہ ترجمان القرآن

Leading into a better tomorrow

ملک وملت کی قیادت آپ کا مقدر ہے

آپ کے خواب آپ کا مستقبل ہیں

آپ کی صلاحیت، آپ کی قوت ہے

اپنے عظیم مستقبل کی بہترین تیاری کیجئے

آئی ایل ایم قیادت سازی کا منفرد ادارہ ہے جو

آپ کی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے

آپ کی کارکردگی کے معیار کو بلند کرتا ہے

آپ کو معاشرہ کا قائد بناتا ہے

ہمارے تعلیمی پروگرام:

MBA: Master of Business Administration
MCS: Master of Computer Science
M.Ed: Master of Education
BBA: Bachelor of Business Administration
BCS: Bachelor of Computer Science
BTTM: Bachelor of Textile Technology & Management
B.Ed: Bachelor of Education
BIE: Bachelor of Industrial Engineering

یہ تمام پروگرام ہمدرد یونیورسٹی سے الحاق شدہ ہیں۔

Institute Of Leadership And Management

11-Aibak Block, New Garden Town, Lahore.
Tel: (92-42) 5869312-16 , Fax: (92-42) 5865802 , E-Mail: info@ilmcs,brain.net.pk

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد   نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۵   اپریل ۱۹۹۸ء، ذی الحجہ ۱۴۱۸   عدد ۴

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۴۳۶۰۵

فیکس: ۷۸۴۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زرسالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۳۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

سب جانتے ہیں کہ قادیانی گروہ، انگریزی امپریلزم کا بہت چہیتا متبنٰی ہے۔ بظاہر یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ "سامراج شکن" اور "ترقی پسند" حضرات کا ان "سامراج پرستوں" اور "رجعت پسندوں" سے کیا رشتہ؟ اور ایک پنڈت کو متکلم اسلام کی حیثیت اختیار کرنے کی کیا ضرورت؟ اور اس مسئلے سے اس کو کیا دلچسپی کہ کون سا گروہ دائرۂ اسلام کے اندر ہے اور کون سا باہر؟ لیکن ذیل کا اقتباس پڑھ کر آپ کی حیرت، عبرت سے بدل جائے گی۔ اب سے کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر شنکر داس نے اخبار بندے ماترم میں لکھا تھا:

ہندستانی قوم پرستوں کو اگر کوئی امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے تو وہ احمدیت کی تحریک ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان جس قدر احمدیت کی طرف راغب ہوں گے، اسی قدر قادیان کو مکہ تصور کرنے لگیں گے اور آخرکار قوم پرست بن جائیں گے۔ مسلمانوں میں اگر کوئی تحریک عربی تہذیب اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کر سکتی ہے تو وہ یہی احمدی تحریک ہے..... جس طرح ایک ہندو کے مسلمان بن جانے پر اس کی شردھا اور عقیدت رام، کرشن، وید، گیتا اور رامائن سے اٹھ کر حضرت محمدؐ، قرآن مجید اور عرب کی بھومی میں منتقل ہو جاتی ہے، اسی طرح جب کوئی مسلمان احمدی بن جاتا ہے تو اس کا زاویہ نگاہ بھی بدل جاتا ہے۔ حضرت محمدؐ میں اس کی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور جہاں پہلے اس کی خلافت، عرب میں تھی، اب وہ قادیان میں آ جاتی ہے..... ایک احمدی، خواہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہو، روحانی شکتی حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا منہ قادیان کی طرف کرتا ہے"۔

یہ چند فقرے "قوم پرست" کے ضمیر کو بالکل بے نقاب کر دیتے ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ "جغرافی قومیت" کا مفاد، اسلام کے مفاد کی عین ضد واقع ہوا ہے۔ اسلام کا مفاد اس میں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک عالمگیر مرکز سے وابستہ ہوں، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک قبلہ کے محور پر گھومیں۔ اس کے بالکل برعکس جغرافی قومیت کا مفاد یہ چاہتا ہے کہ ہر جغرافی خطے کا مسلمان اس عالمگیر مرکز و محور سے اپنا تعلق منقطع کر کے، اپنے ہی وطن میں اپنی عقیدتوں کا مرکز پیدا کرے، یعنی مسلمان کے بجائے "قوم پرست" بن جائے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی، اشارات، ترجمان القرآن، جلد ۱۲، عدد ۲، صفر ۱۳۵۷ھ، اپریل ۱۹۳۸ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

حج بیت اللہ

اسوۂ ابراہیمی اور ملّت اسلامیہ کا حالِ زار

خورشید احمد

امت مسلمہ اس اعتبار سے بڑی خوش نصیب ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام بے پایاں ہی نہیں بڑی حد تک منفرد اور بے مثال بھی ہیں۔ قرآن اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر الطاف و عنایات کی اس کہکشاں کے آفتاب و مہتاب ہیں تو نماز' زکوٰۃ' روزہ' رمضان' لیلۃ القدر' حج' عمرہ اور جہاد اس کے روشن اور تابناک ستارے' جن سے نہ صرف یہ کہ حسن کائنات اور جمال ہستی دوبالا ہے بلکہ نور کے یہ مینار دکھی انسانیت کی رہنمائی اور منزل مقصود کی طرف رہبری کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ ماضی کے جھروکوں میں جھانکیں یا حال کے اداروں اور تجربات کا جائزہ لیں' صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی اور خود امت مسلمہ کی ہدایت اور اس کے ذریعے باقی انسانوں کی رہنمائی کے لیے جو انتظام زمین و آسمان کے خالق اور مالک نے مرتب فرمایا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ آقا کی ہر نعمت یکتا اور عظیم ہے اور اس کی ہر نوازش' نور کا منبع اور زندگی کی پیامبر ہے۔ اگر رب کریم و رحیم کی ان الطاف و عنایات کے باوجود امت کا حال پریشان ہے اور انسانیت کے ستارے گردش میں ہیں تو یہ ایک لمحہ فکریہ ہے___ سوچنے کی بات ہے کہ بگاڑ کہاں کہاں سے دَر آیا ہے اور کوتاہی اور کمی کس کس مقام پر ہے کہ آب حیات کی موجودگی کے باوجود یہ امت صحت مند اور باعزت زندگی' توانائی اور تابندگی سے محروم ہے۔ چاند اور سورج ضوفشاں ہیں لیکن تاریکی چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔

ذوالحجہ کے اس مبارک مہینے میں دنیا کے گوشے گوشے سے لاکھوں فرزندان توحید جوق در جوق بیت اللہ کی طرف سرگرمِ سفر ہیں اور طواف' سعی' قیام عرفات' مزدلفہ و منیٰ اور قربانی و حلق کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو

رہے ہیں۔ ساتھ ہی پوری دنیا میں تقریباً ڈیڑھ ارب مسلمان حج کی اس عظیم عبادت میں جہاں بھی ہیں وہیں سے روحانی طور پر عیدالاضحیٰ کی نماز دوگانہ' قربانی اور ایام تشریق کی تکبیر اور تہلیل کے ذریعہ شریک ہو رہے ہیں اور اس طرح پوری امت' اسوۂ ابراہیمی کی تجدید کر رہی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ارشاد نبویؐ تحاسبوا قبل ان تحاسبوا (اپنا احتساب کر لو قبل اس کے کہ تمارا احتساب کیا جائے) کی روشنی میں احتساب کیا جائے۔ تجدید عہد کے اس موقع پر تھوڑا سا وقت' امت کے سوچنے سمجھنے والے تمام افراد' مرد اور عورتیں' انفرادی اور اجتماعی غورو فکر' تجزیہ اور خود احتسابی کے لیے نکالیں اور پوری دیانت داری سے جائزہ لیں کہ حج ہر ذی استطاعت مسلمان مرد اور عورت پر زندگی میں کم از کم ایک بار فرض کیا گیا ہے۔ عمرہ کی شکل میں بیت اللہ کی زیارت اور عہد ایمانی کی آبیاری کا دائمی نظام قائم کیا گیا ہے اور عیدالاضحیٰ کی شکل میں ہر سال پوری امت کے لیے اسوۂ ابراہیمی کی تذکیر اور اس پر عمل پیرا رہنے کے عہد کی تجدید کا سامان کیا گیا ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ دینی اور دنیاوی' روحانی اور جسمانی ہر قسم کے ان بے پناہ و بے شمار فوائد اور برکتوں سے امت اور اس کے ہر ہر فرد کا دامن بھر جائے جن کی نوید خود قرآن نے سنائی ہے (لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ وہ ان منافع کا مشاہدہ اور تجربہ کر سکیں جو اس میں ان کے لیے ہیں۔ الحج ۲۲:۲۸)۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس کے وہ اثرات جو مطلوب و موعود ہیں وہ ہماری انفرادی اجتماعی زندگی میں کیوں رونما نہیں ہو رہے؟

اسلام اور دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے تصور عبادت میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں عبادت محض پوجاپاٹ کا ایک نظام بن کر رہ گئی ہے یا دنیاوی زندگی سے کٹ کر خدا سے لو لگانے اور اس کے لیے مراقبہ' نفس کشی' مجاہدات و ریاضات یا چند ذہنی اور بدنی التزامات کا نام ہے جن سے خدا کو خوش کیا جا سکے اور اس طرح اخروی نجات حاصل ہو سکے۔ اس کے برعکس اسلام کا تصور یہ ہے کہ عبادت ہی دراصل وہ مقصد ہے جس کے لیے انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ' میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ ذریت ۵۱:۵۶)۔ عبادت ہی کی زندگی کی طرف ان کو بلایا گیا ہے (يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ' لوگو' بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے۔ البقرہ ۲:۲۱)۔ رب کی اس بندگی کی طرف ساری انسانیت کو' خصوصاً پہلے انبیا کی امتوں کو' دعوت دی گئی ہے۔ (قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ' اے نبیؐ' کہو' "اے اہل کتاب' آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے

درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں آل عمران ۳:۶۴)۔ یہ عبادت محض چند مراسم عبادت تک محدود نہیں' گو متعین عبادات اس کے اہم ستون اور مقصود بالذات سنگ میل ہیں۔ اسلام کا تصور عبادت یہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی اللہ کی بندگی میں بسر ہو۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا' سونا جاگنا' کھانا پینا' آرام اور محنت' حضر و سفر' غرض سب کچھ خدا کی بندگی اور اس کے قانون اور ہدایت کی پابندی میں ہو اور زندگی کا جو مشن اور شب و روز کے لیے جو ترجیحات مالک اور آقا نے مقرر کی ہیں پوری زندگی انھی کے مطابق بسر کی جائے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ـ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (الانعام ۶:۱۶۲-۱۶۳) "کہو' میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا' سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں"۔

گویا اسلام اور عبادت ہم معنی اور ایک ہی طرز زندگی کے دو عنوان ہیں۔ اسلام انسان کی پوری زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے اور اس کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ کلمہ شہادت کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آجاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا رب اور معبود تسلیم کیا ہے اس کا بندہ بن کر پوری زندگی گزارے --- عبادت بندہ بن کر رہنے ہی سے عبارت ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ بندہ نفس کی خواہشات پر قابو پائے اور اپنے جسم و جان اور قلب و نظر کی تمام صلاحیتیں زندگی کے ان مقاصد کے حصول کے لیے صرف کرے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے متعین کر دیے ہیں۔ ہر مرد اور عورت جو بندگی کا راستہ اختیار کرے اس کے اخلاق اور سیرت و کردار ان سانچوں میں ڈھل جائیں جو شریعت نے مقرر کیے ہیں۔ دنیوی زندگی میں' جہاں قدم قدم پر آزمایش اور راہ حق سے پھسل جانے کے مواقع پیش آتے ہیں' بندہ حیوانی اور شیطانی طریق کار سے بچتے ہوئے اور پورے شعور اور ارادے سے اس راہ پر گامزن رہے جو رب کو پسند ہے۔ یہ عبادت کی روح اور اس کا جوہر بھی ہے اور پوری زندگی میں اس کا مظہر اور مطلوب بھی۔

پوری زندگی کا اس طرح عبادت کا مظہر بن جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ایمان کی لازوال قوت کے ساتھ ساتھ بڑی زبردست اور ہمہ گیر ذہنی' روحانی' بدنی' انفرادی اور اجتماعی تربیت کی ضرورت ہے تاکہ فکر و نظر میں بھی یہ انقلاب مستحکم ہو جائے اور انفرادی اور اجتماعی سیرت و کردار بھی ایسے پیمانوں میں ڈھل جائیں جو فرد اور ملت کو اس عبادت کے لیے تیار کر سکیں۔ منصوص عبادات --- نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج' عمرہ' ذکر' استغفار اور دعا ایسا ہی انسان مطلوب اور امت بنانے کا ذریعہ ہیں۔ یہ خود بھی عبادت ہیں اور

پوری زندگی کو عبادت بنانے کا ذریعہ بھی۔ یہ خود بھی مالک کو پسند اور محبوب ہیں اور انسان کو مالک کا پسندیدہ اور محبوب بندہ بنانے کا ذریعہ بھی ہیں تاکہ وہ مالک کے بتائے ہوئے محبوب و مطلوب مشن ـــــ دعوت الی الخیر، شہادت حق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، قیام قسط اور نصرت دین کے لیے سرگرم عمل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عبادات کو ارکان اسلام کہا گیا، یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم نے ان خدائی ستونوں کا تعلق اس ربانی عمارت سے منقطع کر دیا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ستون ہی عمارت ہیں اور بس۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

عبادت کے اس تصور کی تفہیم اور انسانی زندگی میں اس کے انقلابی کردار کو سمجھنے کے لیے حج کی حقیقت اور اس کے پیغام پر تدبر کی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ویسے تو جتنی بار بھی انسان کو حج بیت اللہ اور عمرہ کی سعادت حاصل ہو، وہ اس کی خوش نصیبی ہے لیکن صرف ایک بار ہر صاحب استطاعت پر اسے فرض کرنے میں غور و فکر کا یہ پہلو بھی پایا جاتا ہے کہ زندگی میں ایک بار بھی ایمان اور احتساب کے ساتھ اس تجربے سے گزرنے سے عبودیت کے سارے ہی پہلوؤں سے انسان ہم آغوش ہو سکتا ہے۔ حج جامع ہے عبادات کے جملہ مراسم و آداب کا، اور اسلام کی عالمگیر اور ازلی دعوت کے نمایاں ترین تاریخی پہلوؤں کا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے دھارے کو عبدیت کی راہ پر رواں دواں کرنے کے لیے یہ تجربہ اگر اپنے پورے آداب کے ساتھ ایک بار بھی ہو جائے تو یہ اتنا قوی اور جاندار ہے کہ پھر عیدالاضحیٰ کی تجدید کے ساتھ ساری زندگی اس رخ پر بسر ہو سکتی ہے۔

حج کے لغوی معنی زیارت کا ارادہ کرنے کے ہیں۔ حج کو حج اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں انسان ان متعین دنوں میں (۸ تا ۱۳ ذوالحجہ) جو اس کے لیے مقرر کیے گئے ہیں (عمرہ یا زیارت کسی وقت بھی ہو سکتی ہے) کعبۃ اللہ کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے اور مناسک حج ادا کرتا ہے۔ حج ہر بالغ اور صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض کیا گیا ہے اور جو شخص حج کی طاقت (جسمانی اور مالی) رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا وہ ایک عظیم ترین سعادت ہی سے محروم نہیں رہتا اپنے مسلمان ہونے کو بھی عملاً جھٹلاتا ہے۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۔ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ۳:۹۷) "لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز

ہے"۔ اس آیت کریمہ میں قدرت رکھنے کے باوجود قصداً حج نہ کرنے کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور حضورؐ نے بھی یہی بات بہ صراحت فرمائی ہے کہ: جو شخص زاد راہ اور سواری رکھتا ہو جس سے بیت اللہ تک پہنچ سکتا ہو اور پھر حج نہ کرے تو اس کا اس حالت پر مرنا اور یہودی یا نصرانی ہو کر مرنا یکساں ہے۔ (متفق علیہ)

اور جو مسلمان عورت یا مرد تمام احکام اور آداب کے ساتھ حج کا فریضہ انجام دیتا ہے اس کے بارے میں شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے' سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے' اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کا دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے اس کا سورج جب ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے" (نسائی و ترمذی)۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے صرف اللہ کے لیے حج کیا' اور اس میں ہوس رانی اور گناہ نہ کیا' تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا"۔

غور کرنے کی بات ہے کہ حج کی وہ کیا اہمیت اور خصوصیت ہے جس کی بنا پر ایک طرف قصداً اس کے کرنے کے انکار کو کفر کے مترادف قرار دیا گیا اور دوسری طرف ایمان اور احتساب کے ساتھ اس کی ادائیگی کو پچھلے گناہوں سے پاکی کا ضامن قرار دیا گیا اور اس کے بعد بالکل ایک نئی پاک و صاف زندگی کا باب کھول دیا گیا۔

سب سے پہلی بات حج کا کعبہ سے تعلق ہے جو زمین پر خدا کا گھر' امت مسلمہ اور انسانیت کا مرکز و محور اور رب کعبہ سے خصوصی نسبت رکھتا ہے۔ حج کی اصل بیت اللہ کی زیارت اور اسوۂ ابراہیمی کا تجربہ اور تجدید ہے۔ اس پورے عمل میں ایک طرف دعوت اسلامی کے سارے تاریخی مراحل سے انسان کو گزار دیا جاتا ہے تو دوسری طرف تمام منصوص عبادات کی روح اور ان کے خلاصے کو بھی اس میں سمو دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ مراسم عبادات کی جامع اور ایک جلوہ میں ہزار جلوں کی تجلی گاہ بن جاتی ہے۔ کعبہ اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر اور بندوں کی پہلی عبادت گاہ ہے جو توحید کی علامت اور رب کے حضور بندگی کے لیے پہلی سجدہ گاہ ہے۔ زمین پر انسان کے سفر عبودیت کا آغاز اس مرکز سے ہوا اور آج تک پوری انسانیت کے لیے یہی بندگی کا محور ہے۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سب اطراف کے رہنے والے اسی کی طرف رخ کر کے اپنے مالک کو پکارتے اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اسے بندگی کا محور اور ملت اسلامیہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ اس گھر کی زیارت حج کا مقصود و مطلوب ہے تاکہ بیت اللہ کی زیارت سے رب بیت اللہ سے رشتہ استوار کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر اس سادہ تعمیر سے زیادہ حسین' دیدہ زیب اور ایمان افروز مقام کوئی دوسرا نہیں۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ کعبہ بیت اللہ ہی نہیں اس کے ساتھ اللہ کے برگزیدہ نبی ابو الانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے جلیل القدر فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعوت حق' شان اطاعت و فدویت اور یکسوئی اور قربانی کے مثالی نمونوں کی یادیں وابستہ ہیں۔ اللہ کے حکم سے انھی برگزیدہ انبیا نے بیت اللہ کی موجودہ تعمیر مکمل کی تھی اور اس پر بیت عتیق اور مکہ کے گرد و نواح کے چپے چپے پر اسوۂ ابراہیمی کے نقوش ثبت ہیں۔ دعوت اسلامی کی تاریخ میں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور عالمی مسائی ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ نے ایمان و یقین' اطاعت و سپردگی' عبودیت و فدویت' ایثار و قربانی اور جہد مسلسل کا وہ نمونہ پیش کیا جو ہمیشہ کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ اللہ سے آپ کی محبت اور اللہ کا آپ کو اپنا خلیل کہنا وہ شرف ہے جس نے آپ کو پوری انسانیت کا محبوب بنا دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس انسان کامل پر نبوت کے سلسلۃ الذھب کا خاتمہ اور تکمیل ہوئی وہ اور آپ شانہ بشانہ کھڑے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے ساتھ اگر کسی نبی کی طرف مسلسل درود و سلام کی سوغات بھیجی جاتی ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں (اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم)۔

حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام ان کے مثالی کردار کی وجہ سے حاصل ہوا۔ ان کو آزمایشوں کی کسوٹی پر بار بار پرکھا گیا اور وہ ہر بار آزمایش کی کٹھالی سے کامیاب و کامران نکلے۔ انھوں نے عین عالم جوانی میں اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں اپنی قوم کے بت کدے میں اذان دی اور ان بتوں کو پاش پاش کر دیا جن کو انھوں نے معبود بنا رکھا تھا۔ جب ان کو دین آبا کی توہین کی پاداش میں آگ میں ڈالا گیا تو "بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق"۔ فرعون نے جب اپنے جبر و اقتدار کا سہارا لے کر اپنی الوہیت کا دعویٰ کیا تو انھوں نے برہان قاطع سے اس کو لاجواب کر دیا اور اپنی جان کی کوئی پروا نہ کی۔ جب ان کو دعوت حق کو پھیلانے کے لیے اپنے خاندان' قوم اور وطن سب کچھ چھوڑنے اور اللہ کے لیے ہجرت کرنے کا حکم ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر کمربستہ ہو گئے اور چار دانگ عالم میں اللہ کے کلمے کو پہنچانے کے لیے مصروف جہاد ہو گئے۔ اور پھر جب ان کو اپنے محبوب لخت جگر کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کا حکم ملا تو بلاتوقف اس کی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہو گئے --- حکم الٰہی کی تعمیل' دعوت حق کی تشریح و توضیح اور آقا کی مرضی اور محبوب کے اشارہ چشم و ابرو پر سب کو قربان کر دینے کی یہی وہ ادا ہے جس نے جاں بازی' جاں نثاری اور جاں سپاری کی وہ روشن مثال قائم کی جو اسوۂ ابراہیمی کی اصل اور انسانیت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نمونہ اور معیار بنا دی گئی۔ حج

اسی تاریخ دعوت و عزیمت کی یاد دہانی اور اس تاریخ کو از سرنو رقم کرنے کی دعوت اور اس کے لیے تیاری کی مشق ہے۔ حج کا مقصد اللہ کے حکم کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حقیقی حج کے ساتھ تشبّہ اختیار کر کے ان کے نمونہ ایمان و للّہیت' جذبہ عبدیت اور کمال فدویت و فدائیت کو یاد کرنا اور ان کی روشن مثال سے خود اپنے اندر ایمان' اطاعت اور ایثار و قربانی کے جذبہ کی آبیاری کرنا ہے۔ مالک کی پکار پر لبیک کہنا اور ساری زندگی کو پوری آمادگی شوق اور وارفتگی سے اس کی رضاطلبی کے لیے وقف کر دینا ہے۔ لبیک اللھم لبیک' لبیک لا شریک لک لبیک' ان الحمد والنعمة ولک الملک' لا شریک لک (اے اللہ! میں حاضر ہوں' میرے اللہ' میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں' اس میں کوئی شک نہیں کہ حمد تیری ہی ہے' نعمتیں تیری ہی دین ہیں اور بادشاہی اور اقتدار صرف تیرا ہی ہے' اور ان سب میں تیرا کوئی شریک نہیں)۔ یہ صرف ایام حج کا تلبیہ اور ترانہ ہی نہیں اللہ کے بندوں کے لیے پوری زندگی کا وظیفہ ہے۔ یہ مالک کے حضور مکمل سپردگی کا عہد ہے جس کی مثال اور نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کے سامنے رکھا۔ حج کا اصل سبق اور پیغام یہی سپردگی ہے۔

حج کے مناسک پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گھربار اور کاروبار کو چھوڑنے' سفر کی صعوبتیں انگیز کرنے اور روایتی لباس ترک کر کے احرام کے فقیرانہ لباس زیب تن کرنے سے لے کر طواف' سعی' وقوف عرفات' مزدلفہ کی شب باشی' منیٰ کا قیام' قربانی' رمی جمار اور حلق (سر کے بال منڈوانا) تک ہر چیز سے بندگی کی تصویر ابھرتی ہے اور ان میں سے ہر عمل کی اسوۂ ابراہیمی کے کسی نہ کسی پہلو سے نسبت ہے۔ للّہیت' سپردگی' اطاعت اور فداکاری کی شان ہر ہر عمل سے نمایاں ہے اور یہی حج کا اصل رمز ہے اور اس پورے تجربے میں تعلیم و تربیت کا بڑا موثر ساماں ہے تاکہ بندہ یہاں سے یہ سبق لے کر جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہی ہمارا راستہ' ان کا نمونہ ہی ہمارے لیے نمونہ اور اس راستے پر چلنا اور اس نمونے کا اتباع ہماری زندگی کا مقصود ہو گا اور اس راہ میں ہمارے قدم کبھی ست نہیں ہوں گے۔

حج پر غور و فکر کا تیسرا پہلو اس کی جامعیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حج تمام ہی مراسم عبادت کا جامع ہے۔ نماز کا آغاز اگر نیت کی درستی' قبلہ کے استقبال اور بدن کی طہارت سے ہوتا ہے اور اس کی روح ذکر الٰہی ہے' تو حج پہلے ہی مرحلے سے ان سب کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ بیت اللہ کی طرف رخ ہی نہیں اس کا قصد اور اس کی طرف سفر اور پھر اس کا طواف اور اس کی طرف سجدے ہی سجدے' احرام اور جسم اور

روح کی طہارت اور حج کی نیت سے لے کر طواف وداع تک ذکر ہی ذکر۔ نماز اگر فحش اور منکرات سے روکنے کا ہتھیار ہے (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ' بے شک نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے) تو احرام بھی فحش اور منکرات کے باب میں ایک حصار ہے۔ حج کے پورے عمل کو خواہش نفس سے پاک کرنا اور گناہوں سے بچانا آداب حج کا حصہ ہیں۔ زکوٰۃ مالی عبادت ہے جو ایک طرف حب دنیا اور حب دولت سے انسان کو بچاتی ہے تو دوسری طرف معاشرے سے بھوک اور غربت کو مٹانے اور معاشی عدم مساوات کو کم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ حج میں بھی انسان کو کثیر مالی قربانی کرنا پڑتی ہے۔ صرف زاد راہ اور قربانی ہی کے لیے نہیں بلکہ ایک عرصے کے لیے ترک معاش اور اہل خاندان کے لیے معاش کے انتظام کی شکل میں۔ احرام پوری امت کے لیے مساوات کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتا ہے اور امیر غریب' بادشاہ فقیر' سب ایک ہی لباس میں آ جاتے ہیں۔ قربانی کا گوشت غریبوں اور مستحقین میں تقسیم ہوتا ہے اور اس طرح زکوٰۃ کی روح بھی حج میں سما جاتی ہے۔ روزہ کا مقصد بھی تقویٰ پیدا کرنا' ضبط نفس کی تربیت دینا' جسمانی مشقت انگیز کرنے کے لیے تیار کرنا' تعلقات زن و شو سے احتراز (صرف دن ہی میں نہیں' حج کی راتوں میں بھی) بے آرامی اور ذکر کی کثرت کی فضا بناتا ہے۔ حج میں یہ سب اپنے اپنے انداز میں موجود ہیں۔ روزہ کو قرآن سے خصوصی نسبت ہے۔ حج میں بھی قرآن کی تلاوت اور مقامات نزول قرآن کی زیارت روزہ کے ان پہلوؤں کا لطف پیدا کر دیتا ہے۔ نماز کی باجماعت ادائگی' زکوٰۃ کی بیت المال کے نظام کے ذریعہ منظم تقسیم اور روزہ کو ایک ہی مبارک مہینہ میں تمام امت کے لیے فرض کرنے میں اجتماعیت کی جو شان ہے' حج اس کی معراج ہے۔ غرض اس ایک عبادت میں جو بالعموم کئی مہینوں پر پھیلی ہوئی ہے اور سفر کی جدید سہولتوں کے باوجود کئی ہفتوں کا اعتکاف اور انہماک تو لازماً چاہتی ہے' عبادت کے تمام ہی مراسم اور ان کے اہداف کسی نہ کسی شکل میں جمع کر دیے گئے ہیں جو اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور یادگار تجربہ ہے۔

حج کا ایک اور منفرد پہلو امت کی وحدت اور انسانیت کے ایک خاندان اور برادری ہونے کو نمایاں کرنا ہے۔ رنگ' نسل' وطن' زبان' مرز بوم' سماجی تنوع' معاشی تفاوت غرض ہر فرق ختم ہو جاتا ہے اور ایک اللہ کے ماننے والے بیت اللہ کی زیارت اور طواف کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے ایک مرکز پر جمع ہوتے ہیں اور ایک خاندان کی طرح ایک امام کی قیادت میں ایک ہی تلبیہ کا ورد کرتے ہوئے دن رات ساتھ گزارتے ہیں' تہذیب و تمدن کے سارے خول اتر جاتے ہیں اور صرف للہیت اور انسانیت کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور ان سب کا آخری ہدف اللہ کی رضا کا حصول' زمین پر اس کی مرضی پوری کرنے کا عزم' استخلاف فی الارض کے مشن کی تنفیذ کے جذبے کو تازہ کرنا اور دین کی دعوت اور نصرت کی جدوجہد میں زندگی وقف کرنے کا داعیہ اجاگر کرنا بن جاتا ہے۔ یہ وہ انقلابی مقصد ہے جس کے لیے اس امت کو برپا کیا گیا اور اس کی تذکیر حج کا

اصل وظیفہ ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی سیرت النبیؒ (جلد پنجم' ص ۳۱۹-۳۲۱) میں اس پہلو کو اس طرح بیان کرتے ہیں:
"خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے..... یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا' اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جس کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے' مختلف زبانیں بولتے ہیں' مختلف لباس پہنتے ہیں' مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب کے سب' باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت' قومیت' تمدن و معاشرت' رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن' ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں..... لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت و وطنیت کی تنگ نائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں' مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدیؐ کی تجدیدی پکار نے سیکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی۔ لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان کے ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں' مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیمؑ کے لیے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں' لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم' تمدن' مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے.....

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے' یہ حج کا موسم ان کی سیاسی اور تنظیمی ادارے کا سب سے بڑا عنصر رہا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے' اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے' اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے' اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں' تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھیں' اور انصاف پاتی تھیں۔ اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال ہا سال دور دراز اقلیموں' ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے' جب سفر اور آمدورفت کا مسئلہ آسان نہ تھا اس کا اصل راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آخری حج جو حجتہ

الوداع کہلاتا ہے اسی اصول پر کیا۔ وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ و تنہا رہا' ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک وقت خطاب کیا اور سب نے سمعاً و طاعةً کہا۔ آپؐ کے بعد خلفاے راشدینؓ اور دوسرے خلفا کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ اور ائمہ اعلام نے اسی طرح سال بہ سال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی' اس کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں"۔

ہم نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحریر سے یہ طویل اقتباس اس لیے دیا ہے کہ حج کے اس منفرد پہلو کو ایک روایتی عالم دین کے الفاظ میں اجاگر کریں ورنہ محدود مذہبی ذہن رکھنے والے تو اس پر "دین کی سیاسی تعبیر" کی پھبتی کستے نہیں تھکتے۔ حالانکہ یہ اسلام کا ایک ایسا اعجاز اور تاریخی کارنامہ ہے جس پر مخالف بھی ششدر رہ جاتے ہیں۔ حال ہی میں شائع ہونے والی آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف موڈرن اسلامک ورلڈ (مطبوعہ آکسفورڈ یونی ورسٹی' ۱۹۹۵' جلد ۲' ص ۱۸۸' مقالہ حج از رابرٹ بیانشی (Robert Bianchi) میں یہ جملے قابل غور ہیں:

"دنیا کی تمام زیارتوں میں حج منفرد بھی ہے اور اہم ترین بھی۔ عیسائیت اور ہندومت کے قدیم اور اعلیٰ ترقی یافتہ بین الاقوامی زیارت کے نظاموں سے مقابلہ کیا جائے تو عقیدے کی مرکزیت' جغرافیائی ارتکاز اور تاریخی تسلسل کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے"۔ (ترجمہ)

اس پہلو سے اگر غور کیا جائے تو جس طرح حفظ قرآن' کتابت و تعلیم قرآن اور رمضان المبارک میں قرآن سے تجدید تعلق نے اللہ کی کتاب کو محفوظ رکھا ہے اسی طرح حج نے اسلام کی اصل روح--- للہیت' عبدیت اور امت کی وحدت اور اخوت کو اس طرح ایک تاریخی نظام میں پرو لیا ہے۔ ایک ادارے کے طور پر یہ روایت اپنے مرکز سے پوری دنیا میں اور ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک دور سے دوسرے دور کی طرف برابر منتقل ہو رہی ہے اور ان شاء اللہ تاابد ہوتی رہے گی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس پہلو کو بڑی خوب صورتی سے نمایاں کرتے ہیں:

"پس اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ جس طرح رمضان کا مہینہ تمام اسلامی دنیا میں تقویٰ کا موسم ہے' اسی طرح حج کا زمانہ تمام روئے زمین میں اسلام کی زندگی اور بیداری کا زمانہ ہے۔ اس طریقہ سے شریعت بنانے والے حکیم و دانا نے ایسا بے نظیر انتظام کر دیا ہے کہ ان شاء اللہ قیامت تک اسلام کی عالمگیر تحریک مٹ نہیں سکتی۔ دنیا کے حالات خواہ کتنے ہی بگڑ جائیں اور زمانہ کتنا ہی خراب ہو جائے' مگر یہ کعبہ کا مرکز اسلامی دنیا کے جسم میں کچھ اس طرح رکھ دیا گیا ہے جیسے انسان کے جسم میں دل ہوتا

ہے۔ جب تک دل حرکت کرتا رہے' آدمی مر نہیں سکتا چاہے بیماریوں کی وجہ سے وہ ہلنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ بالکل اسی طرح اسلامی دنیا کا یہ دل بھی ہر سال اس کی دور دراز رگوں سے خون کھینچتا رہتا ہے اور پھر اس کو رگ رگ تک پھیلا دیتا ہے۔ جب تک اس دل کی یہ حرکت جاری ہے اور جب تک خون کے کھینچنے اور پھیلنے کا سلسلہ چل رہا ہے' اس وقت تک یہ بالکل محال ہے کہ اس جسم کی زندگی ختم ہو جائے' خواہ بیماریوں سے یہ کتنا ہی زار نزار ہو"۔ (خطبات' حصہ چہارم' ص ۱۵۲)

حج کی یہی برکتیں اور منافع ہیں کہ ساری خرابیوں کے باوجود اس امت میں زندگی اور حرارت ہے۔ اگر شر کی قوتیں ہر طرف سے حملہ آور ہیں تو حق کی قوتیں بھی مدافعت' مزاحمت اور پیش رفت میں مصروف ہیں اور یہ سب اس کے باوجود ہے کہ حج اور تمام ہی عبادات' مختلف وجوہ سے اپنے اثرات بکمال و تمام پیدا نہیں کر پا رہیں اور اسلام نے تجدید و اصلاح کا جو نظام بنایا ہے وہ بڑی حد تک مفلوج ہے۔ بلاشبہ امت میں نیک نفوس بھی موجود ہیں اور چند متحرک گروہ بھی جو دین کو اس کی اصل اسپرٹ میں قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی امت غفلت اور دین کے بارے میں بے توجہی کا شکار ہے' اور خصوصیت سے بااثر طبقات' جدید تعلیم یافتہ لوگ اور برسراقتدار عناصر اپنی ذمہ داریوں سے غافل' نفس پرستی اور دنیا داری میں مگن اور قیام دین اور احیائے شریعت سے کنارہ کش ہیں۔ عبادتیں بڑی حد تک اپنی اصل روح سے عاری اور محض رسم اور عادت بن گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن' سنت اور شریعت کی موجودگی' نماز' روزہ' زکوۃ اور حج کی پاسداری' مسجدوں اور مدرسوں کے قیام و انصرام اور دعوتی اور تبلیغی اجتماعات کی ریل پیل کے باوجود نمازیں اثر سے خالی ہیں' روزے تقویٰ کی فصل بہار پیدا نہیں کر پا رہے' زکوۃ معاشی اور سماجی انصاف کے قیام پر منتج نہیں ہو رہی اور حج میں لاکھوں کے اجتماع کے باوجود ملت کے جسم میں تازہ خون نہیں آ رہا اور بدن فساد خون کا شکار ہے۔

تمام خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود جو مثبت اثرات حج اور دوسری عبادات کے رونما ہو رہے ہیں ان کے پورے اعتراف اور ان پر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ ہم امت کے تمام ہی ارکان کو اور خصوصیت سے اس کے سوچنے سمجھنے والے عناصر اور دینی اجتماعی قیادت کو ان اسباب کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے ہماری عبادتیں پوری طرح اپنے ثمرات پیدا نہیں کر پا رہیں۔

سب سے پہلی چیز عبادات کی ظاہری ادائیگی اور ان کی اصل روح اور دین کی تعلیمات اور اصلاح کی مجموعی اسکیم میں ان کا رول اور کردار ہے۔ مذہب اور ثقافت کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انقلابی تصور اس وقت تک انقلابی رہتا ہے جب تک اس کی اصل روح بیدار رہتی ہے اور وہ محض

ایک رسم اور بے جان جسم نہیں بن جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت نے نیت کی اصلاح اور ہر عبادت کے ایمان اور احتساب کے ساتھ انجام دینے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ آج مسلمانوں کا بڑا بنیادی مسئلہ دین سے ناواقفیت' عموی جہالت اور تعلیم کی پستی ہے حالانکہ اسلام تو آیا ہی ایک تعلیمی انقلاب برپا کرنے کے لیے تھا اور حصول علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے واجب قرار دیا گیا تھا۔ عبادات اور خصوصیت سے حج کے غیر موثر ہونے میں بڑا دخل ان عبادات کو بلا سمجھے ادا کرنے کا مرض ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ قرآن کی تعلیم' دین و شریعت سے واقفیت اور نظام زندگی میں ان کے کردار کا پورا پورا فہم و ادراک پیدا کیا جائے۔ محض رٹ کر چند سورتوں کو ادا نہ کر لیا جائے۔ بلکہ ہر عبادت کو پوری طرح سمجھ کر' الفاظ کے معنی کا پورا پورا ادراک کر کے اور ہر عبادت کے مقصد اور منشا کے مکمل شعور کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے۔ علم کا یہ حصول ہر فرد کی ذمہ داری بھی ہے اور معاشرے کے تمام باثر افراد کی بھی۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر ایک چرواہے کے مانند ہے اور ہر ایک اپنے اپنے ریوڑ کے بارے میں مسئول ہے (**کلکم راع وکلکم مسؤل عن رعیۃ**) جس کے معنی ہیں کہ ماں' باپ' استاد' گھر کے بزرگ' محلے کے چچ' معاشرے کے لیڈر' مملکت کے ذمہ دار سب کی ذمہ داری ہے کہ جہالت کی اس وبا سے قوم کو نجات دلائیں۔ تعلیمی انقلاب اصلاح احوال کی طرف پہلا قدم ہے۔

اس تعلیمی انقلاب کے تین پہلو ہیں۔ پہلا دین کی ضروری تعلیمات ان کے صحیح مفہوم کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا' دوسرے' ان تعلیمات اور خصوصیت سے عبادات کو ان کی صحیح روح کے ساتھ سمجھنا اور ادا کرنا۔ اور تیسرے' معاشرے میں اچھے نمونے قائم کرنا تاکہ صرف تعلیم و تلقین کے ذریعے ہی نہیں بلکہ عملی تحریک کے ذریعے خیر کو فروغ دیا جا سکے اور بدی کی قوتوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

عبادات سکڑ کر اگر صرف رسوم و رواج بن جائیں اور جسے اللہ سے ملاقات اور مناجات ہونا چاہیے وہ محض ایک بے روح اور بے جان عادت کی شکل اختیار کر لے تو وہ زندگی میں کوئی تبدیلی کیسے لا سکتی ہے۔ آج ہماری نمازیں' ہمارے روزے اور ہمارے حج اس وجہ سے بے اثر ہو گئے ہیں کہ ہم نے ان کو بس ایک رسم' ایک عادت' ایک جسد بے روح بنا دیا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم عبادات کا حق ادا کر رہے ہیں۔ شیخ عثمان بن علی ہجویریؒ **کشف المحجوب** میں فرماتے ہیں کہ ایک صاحب حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے پوچھا: کہاں سے آ رہے ہو' جواب ملا کہ حج سے واپس آ رہا ہوں۔ پوچھا: حج کر چکے؟ عرض کیا کہ کر چکا۔ پوچھا: جس وقت گھر سے روانہ ہوئے اور عزیزوں سے جدا ہوئے تھے اپنے تمام گناہوں سے بھی مفارقت کی نیت کر لی تھی؟ کہا: نہیں یہ تو نہیں کیا تھا۔ فرمایا: بس سفر پر روانہ ہی نہیں ہوئے! پھر فرمایا راہ میں جوں جوں تمھارا جسم منزلیں طے کر رہا تھا تمھارا قلب بھی قرب حق کی منازل طے کرنے میں

مصروف تھا؟ جواب دیا: یہ تو نہیں ہوا۔۔۔ ارشاد ہوا کہ پھر تم نے سفرحج کی منزلیں طے ہی نہیں کیں۔ پھر یہ پوچھا کہ جس وقت احرام کے لیے اپنے جسم کو کپڑوں سے خالی کیا تھا اس وقت اپنے نفس سے بھی صفات بشریہ کا لباس اتارا تھا؟ کہا: یہ تو نہیں کیا تھا۔ ارشاد ہوا: پھر تم نے احرام باندھا ہی نہیں۔ پھر پوچھا کہ جب عرفات کے وقوف اور مزدلفہ کے قیام میں اپنی مراد کو پہنچ چکے تو خواہشات نفسانی کے ترک کا بھی عہد کیا تھا؟ کہا: یہ تو نہیں کیا۔ ارشاد ہوا پھر عرفات اور مزدلفہ میں تم حاضر ہی نہیں ہوئے' پھر پوچھا کہ قربانی کے وقت اپنے نفس کی گردن پر بھی چھری چلائی تھی؟ کہا: یہ تو نہیں کیا۔ ارشاد ہوا: تم نے قربانی نہیں کی۔ اسی طرح سارے سوال پوچھنے کے بعد شیخ نے آخر میں فرمایا کہ "تمھارا حج کرنا نہ کرنا برابر رہا' اب پھر جاؤ اور صحیح طریقے پر حج کرو"۔

دین کی تعلیم' عبادات کی تعلیم اور ان کی حقیقی روح کا شعور پیدا کرنا ہی تعلیم کی اصل ہے۔ ضروری ہے کہ امت کے تمام افراد کو تعلیم و تعلم کے تمام قدیم اور جدید ذرائع استعمال کر کے دین کی بنیادی تعلیمات اور ان کی حقیقی روح اور مطلوبہ نتائج سے روشناس کیا جا سکے۔ تب ہی ہماری عبادات پوری طرح ثمرآور ہو سکتی ہیں ورنہ خطرہ ہے کہ عبادات ہی نہیں ہر دینی عمل' ایمان' احتساب اور تقویٰ کے بغیر بے جان اور غیر موثر رہے گا۔

دوسری چیز عبادات کا شریعت کے پورے نظام سے ربط اور تعلق ہے جہاں ایمان' احتساب اور تقویٰ عبادات کے جسم میں جان ڈالنے کا وظیفہ انجام دیتے ہیں اور ان کے بغیر وہ بس ایک رسم اور ایک عادت رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ان عبادات کا ربط و تعلق پوری شریعت اور اسلامی نظام زندگی سے کٹ جائے تو یہ اس پرزہ کی مانند ہو جاتی ہیں جو خواہ خود حرکت کرلے مگر پوری مشین کو چلانے میں اس کا جو کردار ہے وہ غیر موثر ہو جاتا ہے۔ نیز پوری مشینری سے جو تقویت ان اجزا کو ملتی ہے وہ بھی مفقود رہتی ہے۔

اس وقت امت مسلمہ کا المیہ ہی یہ ہے کہ عبادات کے ستون تو موجود ہیں لیکن ان ستونوں کو جس عمارت کو اٹھانا اور سنبھالنا ہے وہ موجود نہیں اور جب تک وہ عمارت وجود میں نہیں آتی یہ ستون ان درختوں کی مانند ہیں جن کا تنا تو موجود ہے مگر پتے' پھول اور پھل ناپید ہیں۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج انسان کو جس کشمکش اور جدوجہد کے لیے تیار کرتے ہیں' وہ انفرادی سطح پر سیرت سازی کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تنظیم و تشکیل اور زندگی کے ہر شعبہ میں شریعت کے مطابق حالات کی صورت گری کے بغیر اپنے اصل اہداف کو نہیں پا سکتے۔ نظام زندگی کی تصویر ان کے بغیر ناممکن ہے۔ شریعت کے کتنے ہی احکام اور قوانین ہیں جو اجتماعی زندگی کی اصلاح اور معاشرت' معیشت' عدالت اور حکومت پر اسلامی شریعت کی بالادستی کے

بغیر بالذ العمل نہیں ہو سکتے جس کے نتیجے میں زندگی دوئی اور تضاد کا شکار اور شترگر بگی کا نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت اس بگاڑ کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے جو کچھ معاملات میں اللہ کی ہدایت کی پیروی اور کچھ میں اس سے اغماض بلکہ بغاوت کے نتیجہ میں ہوتا ہے اور جس پر اللہ رب العزت نے بندوں پر یہ چارج شیٹ لگائی تھی: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ۔ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرہ ۲:۸۵)' "تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں' ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو"۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی سنگین وعید ہے اور امت کی کمزوریوں' تضادات اور تباہ حالیوں میں بڑا دخل ان تضادات کا ہے جن میں یہ مبتلا ہے اور جو بیک وقت خدا اور اہرمن' ایمان اور کفر' دین اور سیکولرازم سے رشتہ استوار کرنے سے عبارت ہے۔

عبادتوں کے غیر موثر ہونے کی ایک اور وجہ نظام احتساب کا فقدان اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مجرمانہ غفلت ہے۔ قرآن پاک میں اس امت کی جو امتیازی خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان میں تین بہت نمایاں ہیں یعنی (الف) یہ امت ایک امت ہے' (ب) یہ امت وسط ہے اور (ج) یہ امت ایک مشن اور دعوت کی علمبردار امت ہے جو صاحب شریعت امت ہے اور اس شریعت اور اس پیغام کی تمام انسانیت کے لیے گواہ اور شاہد اور اس کی نصرت اور غلبہ کے لیے جدوجہد کی ذمہ دار ہے۔ یہی وہ تین خصوصیات ہیں جو اس امت کے امت ابراہیمی سے تسلسل کی ضامن ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ وَاِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ' "اور یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں' پس مجھی سے تم ڈرو" (المومنون ۲۳:۵۲' مزید دیکھو الانبیا ۲۱:۹۲)

دوسری اور تیسری خصوصیت کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے: وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا (البقرہ ۲:۱۴۳)' "اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو"۔

سورۃ الحج میں ارشاد ہوتا ہے: وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ۔ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ۔ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ۔ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۔ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ۔ ھُوَ مَوْلٰکُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی

وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الحج ۲۲:۷۸) "اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام "مسلم" رکھا تھا' اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے)۔ تاکہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمھارا مولیٰ' بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار"۔

سورۃ آل عمران میں امت کا مشن اس طرح بیان ہوتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ "اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" (آل عمران ۳:۱۱۰' مزید ملاحظہ ہو ۳:۱۰۴)۔

امت کے اس مشن اور کردار کے تعین کے ساتھ ساتھ یہ بھی صاف لفظوں میں بتا دیا کہ نیکی محض دین داری کے نام پر ایک خاص طرح کی وضع قطع اور طاعت اور بندگی کے محدود اعمال میں نہیں بلکہ پوری زندگی کو خدا کی ہدایت کے مطابق ڈھالنے' اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے اور اللہ کی راہ میں جان اور مال سے جہاد کرنے میں ہے۔ صرف اسی راستہ کو اختیار کرنے سے ہماری عبادتیں حقیقی معنی میں ثمرآور ہو سکیں گی اور دنیا خوف اور بھوک کے عفریتوں سے محفوظ ہو کر حقیقی امن گاہ بن سکے گی۔

ارشاد ہوتا ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ ۲:۱۷۷) "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف' بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر' مسکینوں اور مسافروں پر' مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے' نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں' اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی متقی ہیں"۔

نیز فرمایا: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ۴۹:۱۵) "حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے

رسولؐ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں"۔

اس کے ساتھ ساتھ اس امت کو بنی اسرائیل کے آئینے میں یہ تنبیہ بھی کر دی: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (المائدہ ۵:۷۸-۷۹) "بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤدؑ اور عیسیٰ ابن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے' انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا' برا طرز عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا"۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی کہ: "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے' تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہو اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو ضرور ایسا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے کوئی عذاب بھیجے۔ پھر تم اس سے دعائیں کرو گے اور تمھاری دعائیں قبول نہ ہوں گی"۔ (ترمذی)

اسی طرح حضورؐ نے فرمایا: "جو شخص کسی قوم میں رہتا ہو اور ان کے اندر رہ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتا ہو اور وہ لوگ اس کے اس طرز عمل کے بدلنے کی قدرت رکھتے ہوں لیکن اس کے باوجود نہ بدلیں تو اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے دنیا ہی میں ان کو اپنے عذاب میں مبتلا کرے گا" (ابوداؤد' ابن ماجہ)

اور قرآن میں اس امت کو مخاطب کر کے صاف لفظوں میں متنبہ کر دیا گیا کہ اگر برائی کا مقابلہ نہ کرو گے تو محض تمھاری نیکی اور تمھاری عبادتیں تم کو تباہی سے نہ بچا سکیں گی۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الانفال ۸:۲۵)' "اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔

قرآن و حدیث کے ان واضح ارشادات اور اعلانات سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ہماری عبادتیں' ہماری دعائیں اور ہماری نیکیاں اس وقت دنیا میں اپنے ثمرات اور حسنات سے زندگی کا دامن بھر سکیں گی جب ہم فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر امت کے سپرد کردہ مشن دعوت الی الخیر' شہادت حق' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' جان اور مال سے جہاد اور ادائے حقوق کی ذمہ داری کو کماحقہ ادا کریں گے۔ اگر اس میں کوتاہی برتتے ہیں تو پھر انفرادی نیکیوں کے باوجود ہم فتنہ کا شکار ہونے اور اللہ کے عذاب کی مار سے نہ بچ سکیں گے اور ہماری دعائیں بے اثر ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے حالات سے بچائے لیکن یہ ایک

حقیقت ہے کہ امت اور اس کے برسر اقتدار طبقے بڑی غفلت اور بڑی نادانی سے ان خطرات کی طرف بڑھ رہے ہیں اور امت کو تباہی سے بچانے کا راستہ عبادتوں کے ساتھ احقاق حق' ابطال باطل اور اقامت دین کی جدوجہد میں جان اور مال کی بازی لگا دینا ہے۔

اس خلفشار کا ایک پہلو نظام اقتدار کا سند جواز (legitimacy) سے محروم ہونا اور مسلم ممالک میں بنیادی حقوق کی پامالی' آزادی کا فقدان اور نظام شوریٰ کا عدم وجود ہے۔ اسلام میں اقتدار کے لیے سند جواز دو ہی چیزوں سے حاصل ہوتا ہے یعنی شریعت کی بالادستی اور ارباب اقتدار کا امت کا امین اور معتمد علیہ ہونا جو شوریٰ کے ذریعہ وجود میں آئے اور نظام زندگی کو چلائے۔ آج سیاسی آزادی کے حصول کے بعد بھی بیش تر ممالک میں جواز کی یہ دونوں بنیادیں مفقود ہیں۔ پھر اجتماعی زندگی اسلام کی برکتوں اور نعمتوں سے کیسے شادکام ہو اور دشمن کے مقابلے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کیسے بنے؟

اسوۂ ابراہیمی کی یاد دہانی کا یہ تاریخی موقع ان تمام امور پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کی دعوت دے رہا ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اس کے ری پرنٹ' دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ۲۵۰ روپے سیکڑہ دستیاب ہیں۔ منشورات' منصورہ' لاہور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا کے یہ الفاظ ہیں جنھیں امام احمد، مسلم، ترمذی، اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اور حافظ ابو یعلی موصلی نے اپنی مسند میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے:

انت الاول فلیس قبلک شیئ

تو ہی پہلا ہے، کوئی تجھ سے پہلے نہیں

وانت الاخر فلیس بعدک شیئ

تو ہی آخر ہے، کوئی تیرے بعد نہیں

وانت الظاہر فلیس فوقک شیئ

تو ہی ظاہر ہے کوئی تجھ سے اوپر نہیں

وانت الباطن فلیس دونک شیئ

تو ہی باطن ہے، کوئی تجھ سے مخفی تر نہیں

(تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۳۰۳)

بندہ خدا

اللہ کی راہ میں خرچ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سورہ الحدید کا موضوع انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین ہے۔ اسلام کی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں جبکہ عرب کی جاہلیت سے اسلام کا فیصلہ کن معرکہ برپا تھا' یہ سورۃ اس غرض کے لیے نازل فرمائی گئی تھی کہ مسلمانوں کو خاص طور پر مالی قربانیوں کے لیے آمادہ کیا جائے اور یہ بات ان کے ذہن نشین کرائی جائے کہ ایمان محض زبانی اقرار اور کچھ ظاہری اعمال کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے دین کے لیے مخلص ہونا' اس کی اصل روح اور حقیقت ہے۔ جو شخص اس روح سے خالی ہو اور خدا اور اس کے دین کے مقابلے میں اپنی جان و مال اور مفاد کو عزیز تر رکھے' اس کا اقرار ایمان کھوکھلا ہے جس کی کوئی قدر و قیمت خدا کے ہاں نہیں ہے۔

اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں تاکہ سامعین کو اچھی طرح یہ احساس ہو جائے کہ کس عظیم ہستی کی طرف سے ان کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد حسب ذیل مضامین سلسلہ وار ارشاد ہوئے ہیں:

—— ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی راہ خدا میں مال صرف کرنے سے پہلوتہی نہ کرے۔ ایسا کرنا صرف ایمان ہی کے منافی نہیں ہے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے بھی غلط ہے کیونکہ یہ مال دراصل خدا ہی کا مال ہے جس پر تم کو خلیفہ کی حیثیت سے تصرف کے اختیارات دیے گئے ہیں۔ کل یہی مال دوسروں کے پاس تھا' آج تمھارے پاس ہے' اور کل کسی اور کے پاس چلا جائے گا۔ آخرکار اسے خدا ہی کے پاس رہ جانا ہے جو کائنات کی ہر چیز کا وارث ہے۔ تمھارے کام اس مال کا کوئی حصہ اگر آسکتا ہے تو صرف وہ جسے تم اپنے زمانہ تصرف میں خدا کے کام پر لگا دو۔

—— خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینا اگرچہ ہر حال میں قابل قدر ہے' مگر ان قربانیوں کی قدر و قیمت' مواقع کی نزاکت کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ ایک موقع وہ ہوتا ہے جب کفر کی طاقت بڑی زبردست ہو اور ہر وقت یہ خطرہ ہو کہ کہیں اسلام اس کے مقابلے میں مغلوب نہ ہو جائے۔ دوسرا موقع وہ

ہوتا ہے جب کفر و اسلام کی کش مکش میں اسلام کی طاقت کا پلڑا بھاری ہو جائے اور اہل ایمان کو دشمنان حق کے مقابلے میں فتح نصیب ہو رہی ہو۔ یہ دونوں حالتیں اپنی اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ جو لوگ اسلام کے ضعف کی حالت میں اس کو سربلند کرنے کے لیے جانیں لڑائیں اور مال صرف کریں' ان کے درجے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کے غلبے کی حالت میں اس کو مزید فروغ دینے کے لیے جان و مال قربان کریں۔

—— راہ حق میں جو مال بھی صرف کیا جائے' وہ اللہ کے ذمے قرض ہے اور اللہ اسے نہ صرف یہ کہ کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس دے گا بلکہ اپنی طرف سے مزید اجر بھی عنایت فرمائے گا۔

—— آخرت میں نور ان ہی اہل ایمان کو نصیب ہو گا جنھوں نے راہ خدا میں اپنا مال خرچ کیا ہو۔ رہے وہ منافق جو دنیا میں اپنے ہی مفاد کو دیکھتے رہے اور جنھیں اس بات کی کوئی پروا نہیں رہی کہ حق غالب ہوتا ہے یا باطل' وہ خواہ دنیا کی اس زندگی میں مومنوں کے ساتھ ملے جلے رہے ہوں' مگر آخرت میں ان کو مومنوں سے الگ کر دیا جائے گا' نور سے وہ محروم ہوں گے اور ان کا حشر کافروں کے ساتھ ہو گا۔

—— مسلمانوں کو ان اہل کتاب کی طرح نہ ہو جانا چاہیے جن کی عمریں دنیا پرستی میں بیت گئی ہیں اور جن کے دل زمانہ دراز کی غفلتوں سے پتھر ہو گئے ہیں۔ وہ مومن ہی کیا جس کا دل خدا کے ذکر سے نہ پگھلے اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے نہ جھکے۔

—— اللہ کے نزدیک صدیق اور شہید صرف وہ اہل ایمان ہیں جو اپنا مال کسی جذبہ ریا کے بغیر صدق دل سے اس کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔

—— دنیا کی زندگی محض چند روز کی بہار اور ایک متاع غرور ہے۔ یہاں کا کھیل کود' یہاں کی دلچسپیاں' یہاں کی آرائش و زیبائش' یہاں کی بڑائیوں پر فخر اور یہاں کا دھن دولت' جس میں لوگ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوششیں کرتے ہیں' سب کچھ ناپایدار ہے۔ اس کی مثال اس کھیتی کی سی ہے جو پہلے سرسبز ہوتی ہے' پھر زرد پڑ جاتی ہے اور آخرکار بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ پایدار زندگی دراصل آخرت کی زندگی ہے جہاں بڑے بڑے نتائج نکلنے والے ہیں۔ تمھیں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنی ہے تو یہ کوشش جنت کی طرف دوڑنے میں صرف کرو۔

—— دنیا میں راحت اور مصیبت جو بھی آتی ہے اللہ کے پہلے سے لکھے ہوئے فیصلے کے مطابق آتی ہے۔ مومن کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ مصیبت آئے تو ہمت نہ ہار بیٹھے' اور راحت آئے تو اترا نہ جائے۔ یہ تو ایک منافق اور کافر کا کردار ہے کہ اللہ اس کو نعمت بخشے تو وہ اپنی جگہ پھول جائے' فخر جتانے لگے' اور اسی نعمت دینے والے خدا کے کام میں خرچ کرتے ہوئے خود بھی تنگ دلی دکھائے اور دوسروں کو بھی بخل کرنے

کا مشورہ دے۔

—— اللہ نے اپنے رسول کھلی کھلی نشانیوں اور کتاب اور میزان عدل کے ساتھ بھیجے تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں' اور اس کے ساتھ لوہا بھی نازل کیا تاکہ حق قائم کرنے اور باطل کا سرنیچا کرنے کے لیے طاقت استعمال کی جائے۔ اس طرح اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون لوگ ایسے نکلتے ہیں جو اس کے دین کی حمایت و نصرت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اس کی خاطر جان لڑا دیں۔ یہ مواقع اللہ نے تمھاری اپنی ہی ترقی و سرفرازی کے لیے پیدا کیے ہیں' ورنہ اللہ اپنے کام کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔

—— اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے انبیا آتے رہے جن کی دعوت سے کچھ لوگ راہ راست پر آئے اور اکثر فاسق بنے رہے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام آئے جن کی تعلیم سے لوگوں میں بہت سی اخلاقی خوبیاں پیدا ہوئیں' مگر ان کی امت نے رہبانیت کی بدعت اختیار کرلی۔ اب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے۔ ان پر جو لوگ ایمان لائیں گے اور خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے' اللہ ان کو اپنی رحمت کا دہرا حصہ دے گا اور انھیں وہ نور بخشے گا جس سے دنیا کی زندگی میں وہ ہر ہر قدم پر ٹیڑھے راستوں کے درمیان سیدھی راہ صاف دیکھ کر چل سکیں گے۔ اہل کتاب چاہے اپنے آپ کو اللہ کے فضل کا ٹھیکے دار سمجھتے رہیں' مگر اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے' اسے اختیار ہے جسے چاہے اپنے فضل سے نواز دے۔

یہ ہے ان مضامین کا خلاصہ جو اس سورت میں ایک ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان ہوئے ہیں۔

(سورۃ الحدید' تفہیم القرآن ج ۵' ص ۲۹۸-۳۰۰)

برطانیہ کا رسالہ **IMPACT** کراچی میں دستیاب ہے اور درج ذیل پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے:

ڈاکٹر محمد نثار احمد

نثار میڈیکل سنٹر بلاک نمبر I' گلشن اقبال کراچی -75300

فون: 4994429 اوقات صبح: 9تا 1 بجے تک' شام: 6تا 10 بجے تک

پلتے ہو اس کے رزق پر

اور ان داتا بناتے ہو دوسروں کو '

مدد پاتے ہو اس کے فضل و کرم سے

اور حامی و ناصر ٹھیراتے ہو دوسروں کو'

غلام ہو اس کے

اور بندگی بجا لاتے ہو دوسروں کی'

مشکل کشائی کرتا ہے وہ

برے وقت پر گڑگڑاتے ہو اس کے سامنے

اور جب وقت گزر جاتا ہے تو

تمہارے مشکل کشا بن جاتے ہیں دوسرے

اور نذریں اور نیازیں چڑھنے لگتی ہیں دوسروں کے نام کی

(تفہیم القرآن ' جلد ا' ص ۵۴۸)

(خیرخواہ)

انسان کا قتل ناحق

پروفیسر عبدالحمید صدیقی

ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ اخلاقی زوال آ رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں جس افسوسناک انداز سے انسانی جان اور عزت و آبرو کا احترام رخصت ہو رہا ہے وہ ہر اس شخص کے لیے انتہائی پریشان کن ہے، جس کے اندر انسانیت کی کوئی معمولی رمق بھی باقی ہے۔ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے، آپ کو قتل و غارت کے متعدد واقعات ملیں گے۔ انھیں پڑھنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس سفاکی کے پیچھے اشتعال کی کوئی زبردست وجہ کام نہیں کر رہیں، بلکہ نہایت معمولی معمولی باتوں پر بڑی سنگ دلی کے ساتھ قیمتی جانوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ انسانوں کی بستیاں آدمیت سے خالی ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ درندگی کا راج قائم ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ ہر قسم کے گروہی اور سیاسی اختلاف سے بلند ہو کر ذرا اس ہولناکی کو بھی نگاہ میں لائیں جس کا مظاہرہ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے۔

عام قتل کی وجوہ

انسانی خون کی یہ ارزانی کسی ہنگامی اور وقتی صورت حال کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے پیچھے کچھ ایسے عوامل کارفرما ہیں، جن پر انسانیت کے تمام ہمدرد انسانوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر اس کا بروقت تدارک نہ کیا گیا تو انسان بڑی تیزی کے ساتھ تباہی کے راستے پر بڑھتا چلا جائے گا۔ پھر چند سالوں میں اس کا انحطاط اس مقام پر پہنچ جائے گا، جہاں سے اسے سنبھالا دینا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔

جو ملک غیر ملکی حملوں اور دشمنوں کی بم باری سے تباہ ہوتا ہے وہ جلد ہی از سرنو تعمیر ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اس کے اندر بسنے والوں کے حوصلے پست نہ ہوں اور ان میں زندہ رہنے کا جذبہ مضمحل نہ ہو چکا ہو۔ لیکن جس ملک میں انسانیت کا دیوالیہ نکل جائے، جہاں ظلم و ستم اور بدمعاشی کا دور دورہ ہو، جہاں ایک بھائی ہی خود اپنے دوسرے بھائی کی تباہی پر تلا ہو، جہاں کوئی فرد بھی اپنی جان اور عزت و آبرو کو محفوظ محسوس نہ کرتا ہو،

اس ملک کو قدرتی وسائل و ذرائع کی فراوانیاں اور وسیع منصوبہ بندیاں تباہی سے کس طرح بچا سکتی ہیں؟

کسی ملک کی بقا' اس کے استحکام اور اس کی ترقی کا دارومدار انسانی آبادی پر ہے۔ انسان کے لیے خوراک' لباس اور دوسری ضروریات زندگی سے کہیں زیادہ اہم' زندگی کے تحفظ کے متعلق اطمینان ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کا اپنی زندگی کی حفاظت کے متعلق اطمینان پانی اور ہوا سے بھی زیادہ ضروری ہے' تو یہ زیادہ صحیح ہو گا۔ کیونکہ وہ ہوا' پانی اور زندگی کی دوسری ضروریات حاصل کرنے کی صرف اسی صورت میں خواہش اور کوشش کرے گا کہ جب وہ جینے کے حق سے محروم نہ ہو گا۔ زندہ رہنے کا یہی بھروسا اس کے اندر جدوجہد کی امنگ پیدا کرتا ہے اور وہ خداداد صلاحیتوں کو ایک خاص نہج اور راستے پر ڈالتا ہے۔ جس شخص کے سر پر ہر وقت ستم کی تلوار لٹکتی رہے' جسے ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں اور جو اپنی زندگی کو ہر آن ظالموں کی دست درازیوں کی زد میں سمجھتا رہے' اس کی فکری اور ذہنی صلاحیتیں کسی طرح اجاگر نہیں ہو سکتیں۔ مسلسل خوف و ہراس کی کیفیات سے نہ صرف جذبات میں اور دل میں بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے' بلکہ انسان کی ساری قوتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خصوصاً جب اس خوف کے سلسلے' ان اطراف سے پیدا ہونے شروع ہو جائیں' جنھیں وہ اپنی حفاظت کے زبردست مورچے سمجھتا ہو۔

جو حضرات اس [برصغیر پاک و ہند کے پچاس سال سے پہلے] کے حالات پر کچھ بھی نگاہ رکھتے ہیں' وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ انگریز سامراج نے اپنی ساری خامیوں' کمزوریوں اور خود غرضیوں کے باوجود یہاں امن و امان قائم کر رکھا تھا۔ اس نے بلاشبہ ملک کو سیاسی لحاظ سے کچلا اور معاشی اعتبار سے تباہ و برباد کیا۔ اس نے معاشرے میں سے بے ضمیر اور خود غرض لوگوں کو بڑی محنت سے تلاش کیا اور پھر انھیں اپنے بھائیوں کا گلا دبانے کے لیے بڑے شرمناک طریقے سے استعمال کیا۔ اس نے دین اور اخلاق کی بیخ کنی کے لیے ہر انسانیت سوز حربہ استعمال کیا۔ لیکن ان سب تلخ حقائق کو ماننے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس نے ملک کے انتظام و انصرام میں بڑی دلچسپی لی اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے خاطر خواہ انتظامات کیے۔ چنانچہ اگر آج [آزادی سے] پہلے کے ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں آپ کو قتل و غارت کے بہت کم واقعات ملیں گے۔ پھر اگر کبھی اس قسم کے چند واقعات ہو بھی جاتے تھے تو ان کی بڑی تندہی سے تفتیش ہوتی تھی۔ مجرم اکثر و بیشتر گرفتار کر لیے جاتے اور انھیں اپنے جرائم کی قرار واقعی سزا ملتی۔ جس سے مجرموں کے حوصلے پست ہو جاتے اور وہ آج کی طرح بے خوف ہو کر انسانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہ کر سکتے تھے۔

ملکی نظم و نسق میں کمزوری

انگریز کے [یہاں سے] رخصت ہونے سے چند سال پیش تر ہی ملک کا نظم و نسق کافی حد تک ڈھیلا پڑ

گیا تھا۔ اس وجہ سے سماج دشمن عناصر کے حوصلے بڑھنے لگے۔ ایک طرف تو ان ناپسندیدہ عناصر کی سرگرمیاں تیزی سے بڑھتی رہیں اور دوسری طرف مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں میں اختلافات کی ایک ایسی خلیج حائل ہوتی رہی، جس نے بالآخر ایک دوسرے کے خلاف شدید منافرت کی صورت اختیار کرلی۔ غنڈوں نے جذبات کی اس تلخی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی قوم کے ہیرو بن کر دوسری قوم کے افراد کا گلا کاٹنے میں مختلف جتھوں کی رہنمائی کی۔

پاک و ہند کی تاریخ میں اس دور سے زیادہ کوئی تاریک دور نہیں ملتا، جب ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے خوں خوار لوگوں کی سرکردگی میں ان گنت بے گناہ اور بے کس انسانوں کا قتل عام کیا۔ امن پسند شہریوں کی جایدادیں لوٹیں اور جلائیں۔ معصوم اور بے کس عورتوں کی عصمت دری کی اور چھوٹے چھوٹے بچوں تک کو بڑے دردناک طریقے سے وحشت کا نشانہ بنایا۔ جن لوگوں نے وہ روح فرسا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، ان کے جسم پر آج بھی ان حالات کے تصور سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

حصول آزادی کے وقت برعظیم کے مختلف علاقوں میں انسان نے انسان کا جو حشر کیا، اس سے نہ صرف انسانی اقدار کی مٹی پلید ہوئی بلکہ خود انسانی جان کا احترام بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔ یوں لگتا ہے کہ جنگلوں اور ویرانوں میں وحشی جانور اور درندے تو ایک دوسرے کو گوارا کر رہے ہیں، لیکن انسان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بن چکا ہے اور وہ بالکل معمولی اشتعال پر اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے پر تل جاتا ہے۔

ملک آزاد ہونے کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار آئی، ان کا یہ فرض تھا کہ انسان کے منہ کو انسانی خون کی جو چاٹ لگ گئی ہے، اس کی کوئی فکر کرتے۔ لیکن تقسیم ملک کے پیچیدہ مسائل اور الجھنوں نے بعض فرض شناس اصحاب اقتدار کو بھی اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ نتیجہ یہ کہ آدم خور انسان بڑے مزے اور اطمینان کے ساتھ انسانی خون سے لذت حاصل کرتے رہے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد رفتہ رفتہ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا، جو عوامی تائید و حمایت سے یکسر محروم تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے ناجائز اقتدار کی حفاظت کے لیے جہاں حکومت کی انتظامی مشینری کو بے دریغ استعمال کیا، وہاں غنڈوں کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ یہ رجحان اگرچہ قیام پاکستان سے پہلے ہی کسی حد تک شروع ہو چکا تھا، لیکن بعد میں بتدریج اس خطرناک پالیسی پر عمل درآمد بڑھنا شروع ہو گیا اور غنڈا اور غنڈے کا سرپرست ہماری سیاسی زندگی میں ایک فعال عنصر کی حیثیت سے آگے بڑھنے لگے۔

ایک مدت سے حالت یہ ہے کہ ایک طرف ملک کا نظم و نسق بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت کے کارندے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بجائے اپنا پورا وقت اور ساری صلاحیتیں برسراقتدار گروہ کے مفادات کی حفاظت اور پاسبانی میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ انھی خدمات پر ان کی ملازمت

اور ذاتی ترقی کا سارا دارومدار ہے۔ دوسری طرف غنڈوں کے اندر اپنی غیر معمولی اہمیت کا شعور بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو معاشرے کے ناپسندیدہ عناصر سمجھنے کے بجائے ملک کی بہت بڑی کار کن' بلکہ فیصلہ کن قوت خیال کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان کے دل و دماغ میں یہ زعم پیدا ہو گیا ہے کہ اقتدار کی حفاظت اور اس کے ہاتھوں کی تبدیلی میں انھیں بڑی اہم حیثیت حاصل ہے۔ اونچے طبقوں میں ان کی پذیرائی کی وجہ سے ان کے عزائم بہت بڑھ گئے ہیں اور ان کی مہمات کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ اب وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بالکل بے خوف ہو کر بے گناہ شہریوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ حکومت ان تلخ حقائق سے پوری طرح واقف ہے' لیکن وہ ان سے نظر بچانے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ جب ایک اوباش اور بداخلاق آدمی کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے تو اسے لامحالہ چھوٹ دینی پڑتی ہے۔ اسے اس امر کا اطمینان دلانا پڑتا ہے کہ جو جرم وہ کرے گا' اس کی اس سے کوئی باز پرس نہ ہو گی۔ جب نظم و آئین کی پاسبان طاقتیں غنڈا گردی کی سرپرستی کرنے لگیں' تو اس وبا کا انتہائی خطرناک صورت اختیار کرنا کوئی ناقابل فہم بات نہیں ہے۔

دین سے بے تعلقی

قتل و غارت' غنڈہ گردی اور عزت و آبرو پر حملوں کی بڑھتی ہوئی واردات کے بنیادی اسباب میں سب سے بڑا سبب خدا سے بے خوفی اور دین سے بے تعلقی ہے۔ تہذیب و شائستگی' ضبط نفس' انسانی جان اور اس کا احترام پیدا کرنے میں جس قدر خدمت' اللہ پر ایمان نے کی ہے' کسی اور چیز نے نہیں کی۔ ایمان ہی انسان کے لطیف احساسات کو ابھارتا اور اس کے اندر رحم اور شفقت کے احساسات کی آبیاری کرتا ہے۔ انسان جتنا دین سے دور ہو گا' اتنا ہی وہ خود غرض' بے رحم اور شقی القلب ہو گا۔ یہ احساس کہ انسان ایک روح رکھتا ہے جسے اگر تکلیف پہنچے تو وہ مالک الملک کے دربار میں ظالم کے خلاف فریاد کرتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ جو کچھ ظلم و ستم وہ کر رہا ہے' اسے کوئی علیم و خبیر ذات دیکھ رہی ہے۔ اسے دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اس ذات کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہونا ہے۔ یہ احساسات درحقیقت ضبط نفس کے اہم ترین بنیادی محرکات ہیں۔ لیکن اسے اس ملک کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ یہاں قوت و طاقت کے اس لازوال خزانے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے' بلکہ مسلسل ایسے اقدام کیے جا رہے ہیں' جن سے ہماری نئی پود ان تصورات سے یکسر بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔

معاشرتی ڈھانچے کی تبدیلی

ہمارے معاشرتی ڈھانچے کو جس احمقانہ طریق سے تبدیل کیا جا رہا ہے' اس سے بھی جرائم کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ مغربی تہذیب کو اندھا دھند مسلط کرنے کی وجہ سے ہمارے ہاں بہت سی ذہنی اور

اخلاقی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ صبر و قناعت کی جگہ معاشرے میں دولت کی ایک نہ مٹنے والی ہوس اور معیار زندگی بلند کرنے کی اندھا دھند کوشش نے لے لی ہے۔ ہر شخص حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے حدود و قیود سے بالکل آزاد ہو کر اس کے حصول کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اخلاق کی اس پامالی سے انسانی تعلقات کی تقدیس کو شدید نقصان پہنچا ہے اور انسان انھیں مجروح کرنے میں قطعاً کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ لوٹ کھسوٹ کے اس رجحان نے اپنے حدود اور دوسروں کے حقوق کا احترام تو درکنار' احساس تک ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی جان اور آبرو کے مقابلے میں بے جان نوٹوں کی قیمت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ہم چونکہ مغربی تہذیب کے معمار نہیں بلکہ صرف اس کے نقال ہیں' اس لیے اس کے اندر اچھائی کے جو پہلو ہیں' انھیں بھی کم ہمتی کی وجہ سے اپنانے سے قاصر ہیں۔ البتہ اس کی برائیوں کو ہم بڑی سرعت اور خوش دلی کے ساتھ قبول کر رہے ہیں۔ اہل مغرب کی طرح ہم میں نہ تو احساس ذمہ داری ہے' نہ آئین و قانون اور اجتماعی زندگی کے ضابطوں کا احترام اور نہ اپنے کام اور مقصد کی کوئی گہری لگن ہی ہے۔ ہم نے اگر وہاں سے کچھ لیا بھی ہے تو عریانی' فحاشی' شراب خوری' اخلاق سوز فلمیں اور انسانیت سوز ادب!

ہمارا نوجوان اس بات کا تو بڑا دلدادہ ہے کہ وہ مغربی نوجوانوں کی طرح رقص و سرود کی محالس میں بے دھڑک شریک ہو' عورتوں پر آوازے کسے' موٹروں اور سکوٹروں کی چوری کرے اور بنکوں اور بڑے بڑے اداروں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے عجیب و غریب منصوبے بنائے۔ لیکن اس کے دل میں یہ جذبہ کبھی موجزن نہیں ہوتا کہ وہ مدرسوں' کالجوں' یونی ورسٹیوں یا کام کاج کے دوسرے مراکز میں اس انہماک' یکسوئی اور ریاضت کا ثبوت دے جو ہمیں مغربی اداروں' دفاتر اور کارخانوں میں نظر آتی ہے۔ ہماری نئی پود نے مغرب سے جو کچھ لیا ہے اس میں بجز ذہنی اور اخلاقی آوارگی' غیر ذمہ دارانہ طرز عمل' ہنگامہ آرائی اور شورش پسندی کے کوئی تعمیری جذبہ نظر نہیں آتا۔ ایک طرف نوجوانوں کے قلب و دماغ میں اس قسم کے خوفناک رجحانات پرورش پا رہے ہیں اور دوسری طرف فلموں اور جاسوسی ناولوں کے ذریعے انھیں قتل و غارت' ڈاکہ زنی' اغوا اور پھر ان جرائم کی پاداش سے بچنے کے مختلف گر سکھائے جاتے ہیں' جنھیں آزمانے کے لیے وہ مغرب کے کچھ آبرو باختہ لوگوں کی تقلید میں بڑے گھناؤنے جرائم کا بے جھجک ارتکاب کرتے ہیں۔

اخبارات میں جرائم کے جو واقعات ہر روز سامنے آتے ہیں ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں سے بہت بڑی تعداد ایسے مجرموں کی ہوتی ہے جنھوں نے کہیں دور دراز علاقوں میں قانون کی آنکھ سے چھپ کر تربیت نہیں پائی ہے بلکہ ہمارے ان شہروں کے نہایت ہی مہذب اور بارونق حصوں میں قانون کے عین زیر سایہ رہ کر یہ تربیت حاصل کی ہے۔

ہمارے ملک کا معاشرتی نظام جس برق رفتاری سے تبدیل ہو رہا ہے اس نے عوام کو بالکل حواس باختہ

کر دیا ہے۔ نت نئی تبدیلیاں اور خصوصاً ایسی تبدیلیاں جو ان کے قومی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں' ان کی قوت فکر اور ان کے انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہو رہی ہیں اور ان سے لوگوں کے افکار و جذبات میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اہل یورپ کے ہاں اگر تھوڑا بہت ذہنی اور جذباتی سکون باقی ہے تو اس کی بڑی وجہ یونان اور روم کا وہ فلسفہ اور طرز فکر ہے' جس کی بنیاد پر مغربی تہذیب کا محل تعمیر کیا گیا ہے' لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل غیر معقول اور ناقابل فہم ہے۔ ہم اپنے ملک کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام کی مغربی تہذیب کے عین مطابق تعمیر تو کرنا چاہتے ہیں' لیکن اس بات کو یکسر نظرانداز کر رہے ہیں کہ یہ تمدن ایک ایسے مادی طرز فکر کا فطری نتیجہ ہے جس نے مدت ہائے دراز تک مغربی ذہنوں کی آبیاری کی ہے۔ اس بنا پر اہل مغرب اپنے نظام حیات اور فکری پس منظر کے درمیان کوئی تصادم نہیں پاتے اور وہ اس کی جکڑ بندیوں کو بڑی خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں مگر پاکستان میں مختلف صورت حال درپیش ہے۔ یہاں کے عوام کی عظیم اکثریت کا مزاج بنیادی طور پر اس نظام فکر و عقائد کو قبول نہیں کرتا' جو اس کے اوپر زبردستی ٹھونسا جا رہا ہے۔ جو نظام قلب و دماغ کو مطمئن کیے بغیر مسلط کیا جائے گا' وہ لوگوں کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہو گا اور اسے نافذ کرنے اور قائم رکھنے کے لیے بہت سی ناروا پابندیوں بلکہ شدید جکڑ بندیوں سے کام لینا پڑے گا۔

اس صورت حال نے ہمارے عوام کو اپنے مستقبل سے سخت مایوس کر دیا ہے۔ وہ جب سیاسی زندگی کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ جب تعلیمی نظام میں کسی تبدیلی کے آرزومند ہوتے ہیں تو وہاں انھیں قدم قدم پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ معاشی میدان میں سرمایہ دار بڑے اطمینان کے ساتھ جونک کی طرح ان کا لہو چوستا ہے۔ وہ اس سے جان نہیں چھڑا سکتے اور اگر کبھی ایسا کرنے کی جسارت بھی کرتے ہیں تو گولیوں سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ بے بسی کے اس عالم میں بعض لوگوں کے جذبات بھک کر بالکل غلط سمت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگتی ہے۔

جرائم روکنے کی تدابیر

بڑھتے ہوئے جرائم کے ان بنیادی اسباب میں سے بہت سے اسباب ایسے ہیں' جن کا تدارک حکومت کی تدبیر کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ بعض ایسی تبدیلیوں کا تقاضا کرتے ہیں' جو افراد کے بس میں نہیں ہیں۔ لیکن نہ تو سب کچھ حکومت کی تدبیر پر موقوف ہے' اور نہ ہم حکومت کی تدبیر کے انتظار میں قتل و غارت کی اس گرم بازاری کے خاموش تماشائی بن کر بیٹھے رہ سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے جن لوگوں کو بھی اس صورت حال کی کربناکی کا کچھ احساس ہے' ان کا فرض ہے کہ اس کی روک تھام کے لیے جو کچھ بھی وہ کر سکتے ہیں' اس میں کوتاہی نہ کریں۔

اس ضمن میں پہلا قدم یہ ہے کہ ہم عوام الناس کے قلب و دماغ میں اس غیر معمولی احترام کا نقش بٹھائیں، جو اسلام انسانی جان کے لیے قائم کرنا چاہتا ہے، تاکہ انھیں اس امر کا احساس ہو کہ انسانی جان کا زیاں کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، بلکہ اپنے لیے شدید عذاب کو دعوت دیتا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام کافر نہیں ہیں۔ خدا اور رسولؐ اور آخرت کے منکر نہیں ہو گئے ہیں۔ وہ صرف غفلت کا شکار ہیں جسے دور کرنے کے لیے تذکیر کی ضرورت ہے۔ اس گئی گزری حالت میں بھی ان کی اصلاح کے لیے اگر کوئی چیز کارگر ہو سکتی ہے تو وہ باہر سے لایا ہوا کوئی فلسفہ نہیں بلکہ خدا اور اس کے رسولؐ کی تعلیم و ہدایت ہی ہے۔

جرم قتل کی سنگینی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قتل کے پہلے واقعے کا جس انداز سے ذکر فرمایا ہے، اس سے اس جرم کی سنگینی، اس کے مفاسد اور قاتل کی مجرمانہ ذہنیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے:

(ترجمہ) اور ذرا انھیں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو۔ جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا: "میں تجھے مار ڈالوں گا"۔ اس نے جواب دیا: "اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے"۔ آخرکار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا: "افسوس مجھ پر! میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا"۔ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی (المائدہ ۵: ۲۷-۳۲)۔

سورہ مائدہ کی آیات کے ترجمے کا مطالعہ کرنے سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ قتل کا ارادہ ایک ایسے بیمار ذہن کے اندر پرورش پاتا ہے جو انسانیت کے پاکیزہ احساسات سے یکسر محروم ہو چکا ہو۔ جس کی ذہنیت اس حد تک بگڑ چکی ہو کہ وہ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے ان لوگوں کی جان کا دشمن بن جائے جو کامیاب اور بامراد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل انسانیت

کے مشترک احساسات سے یکسر عاری ہوتا ہے۔ اس کے نفس میں اتنا خبث بھر جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ البتہ اسے اپنے گردوپیش جو لوگ بھلے معلوم ہوتے ہیں انھیں مٹانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی ذہنیت کا کوئی سلیم العقل انسان تو مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ یہ مجرمانہ طرزِ فکر وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو باؤلے ہو چکے ہوں۔

اس بیمار ذہنیت کے مقابلے میں ایک صحت مند اور معقول انسان کا رویہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے بھائی کا گلا کاٹنے کے بجائے اس کی زیادتی کو بڑے صبر و تحمل اور بردباری کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ وہ اپنے دشمن کے ارادۂ قتل پر مطلع ہونے اور اس کے ناپاک عزائم کو جاننے کے باوجود اس غیر انسانی فعل کی اپنی طرف سے ابتدا نہیں کرتا۔ یہاں یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام ہمیں یہ تعلیم نہیں دے رہا کہ ہم خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو قتل کے حوالے کر دیں' یا ظالمانہ حملے کی مدافعت سے باز رہیں۔ وہ جو چیز ہمارے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے' وہ صرف یہ ہے کہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ دشمن گھات میں لگا ہوا ہے' اپنی حفاظت کی فکر تو کرنی چاہیے' البتہ اس کے قتل کی فکر نہ کرنی چاہیے۔ اور اس بات کو ترجیح دینی چاہیے کہ ظالمانہ اقدام دوسرے کی طرف سے ہو اور آپ کا دامن ابتداء بالقتل سے بالکل پاک رہے۔ اسی بنا پر بعض اکابر نے خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ کے آخری طرزِ عمل کو اسی آیت کی عملی تفسیر قرار دیا ہے یعنی آپ اقدامِ قتل سے آخر وقت تک اجتناب کرتے رہے۔ اپنا گلا کٹوانا گوارا کر لیا لیکن اس بات کو گوارا نہ کیا کہ کسی مسلمان کے خون سے ان کے ہاتھ رنگین ہوں۔

بعض مترجمین نے اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ المائدہ ۵:۲۸) کا ترجمہ کرتے وقت لفظ "کیونکہ" بڑھا دیا ہے۔ مطلب یہ کہ ہابیل اگر قابیل کی اشتعال انگیزی کے باوجود اس کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے اجتناب کرتا رہا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس کے مقابلے میں بزدل اور کمزور تھا یا وہ اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ دراصل جو چیز اسے اس اقدام سے باز رکھ رہی تھی وہ پروردگار عالم کا خوف تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا خوف نہ صرف انسان کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے باز رکھتا ہے بلکہ انتہائی پر آشوب حالات میں بھی اس کے دماغی توازن کو برقرار رکھنے میں اس کی معاونت کرتا ہے اور اسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دامن کو ظلم سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

اس موقع پر رب العالمین کے الفاظ بھی بڑے معنی خیز ہیں جو قرآن مجید کے کمال بلاغت کو ظاہر کرتے ہیں۔ امام راغبؒ نے مفردات میں الرب کے معنی یہ بیان کیے ہیں: ھو انشاء الشئی حالا فحالا الی حد التمام (رب وہ ہے جو کسی چیز کو بہ تدریج نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچائے)۔ ہابیل جب قاتلانہ عزائم

رکھنے والے بھلائی کے مقابلے میں ہر قسم کے اشتعال سے پروردگار عالم کے خوف کا ذکر کرتے ہوئے اجتناب کرتا ہے تو اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ وہ انسانی زندگی پر ہاتھ ڈال کر اس نظام سے بغاوت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا جو رب العالمین نے اپنی مخلوق کے حفظ و بقا اور تدریج و ترقی کے لیے قائم کر رکھا ہے۔ وہ اس خدائی نظام ربوبیت میں مددگار بننا چاہتا ہے جس میں انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اب جو شخص بھی اس مقدس نظام کے خلاف عمل کرتا ہے' وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی بنا پر شرک کے بعد دوسرے درجے پر جس جرم عظیم کا ذکر کیا گیا ہے' وہ قتل ہے:

> جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے' اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے۔ (الفرقان ۲۵:۶۸)

پھر قتل مومن کے سلسلے میں تو وعید اس سے بھی زیادہ شدید اور سخت ہے۔ اس کی جسارت کرنے والے کے لیے تو وہی سزا رکھی گئی ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے:

> رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ (النساء ۴:۹۳)

احترام انسان

حضور سرور کائناتؐ کی بے شمار احادیث انسانی جان کے احترام کی تعلیم و تلقین سے بھری پڑی ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ کبائر کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا:

> بڑے گناہ یہ ہیں' اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھیرانا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا' انسانی جان کو ہلاک کرنا اور جھوٹ بولنا۔ (مسلم)

دوسری حدیث میں قتل نفس کو ماں باپ کی نافرمانی سے پہلے' شرک کے متصل بیان فرمایا گیا ہے:

> حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبائر کے بارے میں بیان فرمایا' یا آپؐ سے کبائر کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا' انسان کو قتل کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا"۔ (مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین آدمی سب سے زیادہ غضب کے مستحق ہیں' ایک وہ جو حرم [کعبہ] میں بے اعتدالی کرے (مثلاً خون' خرابہ شکار وغیرہ) دوسرا وہ جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے چلانے کی کوشش کرے اور تیسرا وہ جو کسی انسان کا ناحق خون بہانے کے درپے ہو۔ (بخاری)

مسلمان تو مسلمان' اسلام میں تو اس کافر کا خون بہانا بھی گناہ عظیم ہے' جس کو اسلامی حکومت میں ذمی کی حیثیت حاصل ہو چکی ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی ایسے شخص کو مار ڈالے جس سے معاہدہ کیا جا چکا ہو' وہ بہشت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا حالانکہ بہشت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہو جاتی ہے۔ (بخاری)

اب ذرا ایک نگاہ حضور سرور عالمؐ کے ان ارشادات پر بھی ڈال لیں جو حضورؐ نے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے معاملے میں مختلف مواقع پر فرمائے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کس شخص کا اسلام بہتر ہے؟ فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ (بخاری)

مسلمان کے خلاف صف آرا ہونے کو ایک دوسرے مقام پر کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

"عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر"۔ (مسلم)۔

حضور سرور عالمؐ نے مسلمانوں کو بڑی تاکید کے ساتھ مسلمان کی جان کے بارے میں وصیت فرمائی اور قتل مسلم کو کفر اور ارتداد جیسا گھناؤنا فعل قرار دیا۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد پلٹ کر کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ (بخاری)

اب ذرا حجۃ الوداع کے خطبے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر بھی غور کر لیجیے:

حضور سرور کائناتؐ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا' جانتے ہو یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ سب سے بہتر جانتے ہیں' (ابوبکرؓ) کہتے ہیں آپؐ اتنی دیر خاموش رہے کہ ہم خیال کرنے لگے کہ شاید آپؐ اس دن کا کچھ اور نام رکھنے والے ہیں۔ پھر حضورؐ نے فرمایا: کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! ہاں آج بے شک یوم النحر ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا' اچھا یہ شہر کون سا ہے؟ کیا یہ (حرمت والا) شہر (مکہ) نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا بے شک یارسول اللہؐ یہ حرمت والا شہر مکہ ہی ہے۔ تب آپؐ نے فرمایا: دیکھو تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبرو اور تمہارے جسموں کی کھالیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن کی حرمت اس مہینے اور اس شہر میں۔ سنو' میں نے اللہ کا حکم تم کو پہنچا دیا یا نہیں؟ ہم نے کہا بے شک آپؐ نے پہنچا دیا۔ اس وقت آپؐ نے دعا کی' اے اللہ گواہ رہنا اور فرمایا جو لوگ یہاں موجود ہیں' میرا یہ کہنا ان لوگوں تک پہنچا دیں جو موجود نہیں۔ (بخاری)

سرور کائنات ؐ نے مسلمانوں پر ہاتھ اٹھانے والوں کو امت اسلامیہ سے خارج قرار دیا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں"۔ (مسلم)

جو شخص ایک مرتبہ زبان سے کلمہ شہادت ادا کر دے خواہ وہ خوف کی وجہ سے ہی ایسا کر رہا ہو' اس کے قتل کو بھی اسلام نے گناہ عظیم قرار دیا ہے۔ حضرت مقدادؓ بن اسود کی روایت ہے:

انھوں نے کہا یارسول اللہؐ' اگر میری کافر سے مڈبھیڑ ہو جائے اور وہ مجھ پر حملہ کر کے میرا ایک ہاتھ تلوار سے کاٹ دے۔ پھر مجھ سے بچ کر ایک درخت کی اوٹ میں پناہ لے لے اور کہے کہ میں ایمان لے آیا ہوں۔ کیا اس حالت میں اسے قتل کر دوں؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا' اسے مت قتل کرو۔ میں نے بارگاہ رسالت میں عرض کی۔ یارسول اللہؐ اس نے میرا ہاتھ کاٹ دیا ہے اور اس کے بعد ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ حضورؐ نے پھر فرمایا۔ مت قتل کرو اس کو' (اگرچہ تجھ کو اس سے صدمہ پہنچا اور زخم لگا) اگر تو اسے قتل کرے گا تو اس کا وہی حال ہو گا جو اس جرم کے ارتکاب سے پہلے تیرا حال تھا اور تیرا حال وہ ہو گا جو اس کا حال یہ کلمہ ادا کرنے سے پہلے تھا۔ (مسلم)

امام نوویؒ نے اس حدیث کے مطلب میں علما کے اختلاف کو نقل کرنے کے بعد امام شافعیؒ اور ابن قصار المالکیؒ کا یہ قول درج کیا ہے: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا تو اس کا خون ویسا ہی معصوم اور اس کا قتل ویسا ہی حرام ہو گیا جیسا تیرا خون اور تیرا قتل' اسے قتل کرنے سے پہلے تھا اور تو اسے قتل کرنے کے بعد ویسا ہی ہو گیا جیسا وہ لا الہ الا اللہ کہنے سے پہلے تھا۔ یعنی نہ تیرا خون معصوم اور نہ تیرا قتل حرام۔ (شرح مسلم' ج ۱' ص ۶۹)

اسی طرح سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ شہادت زبان سے ادا کرنے والے کو قتل کرنے سے' بڑے سخت الفاظ میں منع فرمایا ہے:

حضرت اسامہ بن زیدؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے ہمیں ایک جنگی مہم پر بھیجا۔ ہم حرقات کے ایک قبیلے سے نبرد آزما ہوئے۔ ہم نے وہاں ایک شخص کو گرفتار کر لیا۔ اس نے فوراً لا الہ الا اللہ کہا۔ لیکن میں نے برچھی سے اس کو مار دیا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس فعل پر ایک خلش پیدا ہوئی۔ میں نے رسول اللہؐ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا اور تو نے اسے مار ڈالا؟" میں نے عرض کیا "اس نے ہتھیار کے خوف سے یہ الفاظ کہے تھے"۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: "کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا تاکہ تجھے معلوم ہوتا کہ اس کے دل نے یہ کلمہ کہا تھا کہ نہیں۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ کا کہنا ہے کہ حضورؐ یہ کلمات بار بار دہراتے رہے' یہاں تک کہ میں نے آرزو کی' "کاش میں نے اسی دن اسلام قبول کیا ہوتا"۔

اسی حدیث کی ایک دوسری روایت جو منقول ہوئی ہے' اس کے آخر میں حضورؐ کے الفاظ ایسے ہیں' جن سے اسامہؓ کے اس فعل پر آپؐ کے شدید اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے:

حضورؐ نے جب اسامہؓ سے اس واقعے کے بارے میں دریافت فرمایا تو حضرت اسامہؓ نے کہا: "یارسول اللہ! اس نے مسلمانوں کو شدید اذیت دے رکھی تھی اور فلاں فلاں کو شہید کر دیا تھا"۔ اس کی صراحت میں حضرت اسامہؓ نے چند افراد کے نام بھی لیے۔ پھر کہا: لیکن جب میں اس پر غالب آیا تو اس نے تلوار کے ڈر سے لا الٰہ الا اللہ کہنا شروع کر دیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "کیا تو نے پھر بھی اسے قتل کر دیا؟" انھوں نے کہا "ہاں"۔ اس پر رسالت مابؐ نے فرمایا: "تو لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دے گا۔ جب وہ قیامت کے دن پیش ہو گا؟" حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: "حضور میرے لیے بخشش کی دعا فرمائیں۔" "لیکن آپؐ بار بار یہی بات دہراتے کہ کیا جواب دے گا تو لا الٰہ الا اللہ کا' جب وہ آئے گا قیامت کے دن"۔ (مسلم)

قتل مومن تو خیر بڑا سنگین جرم ہے۔ حضور سرور عالمؐ نے تو اس شخص کو بھی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے جو کسی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے۔ (مسلم) حضور سرورؐ کائنات نے مسلمانوں کو اس بات سے بھی منع فرمایا ہے کہ وہ تیروں اور نیزوں کو لے کر یونہی بازاروں' مساجد یا اجتماعی زندگی کے دوسرے مراکز میں آ جائیں۔ انھیں اس ضمن میں اس بات کی سخت ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان کے ضرر رساں حصوں کو پوری طرح ڈھانک کر رکھیں تاکہ ان سے کسی کو غفلت میں بھی کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ یہ حکم صرف تیر' نیزے یا تلوار پر ہی حاوی نہیں بلکہ اس کے تحت ہر وہ ہتھیار یا چیز آ جاتی ہے۔ س سے ضرر پہنچنے کا کوئی احتمال موجود ہو۔ (مسلم' شرح نووی' ج ۲' ص ۳۲۸)

قیامت کے روز ایک شخص جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہو گا تو اس سے پہلا سوال انسانی خون کے بارے میں ہی کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ نے حضورؐ کا فرمان یوں روایت کیا ہے:

قیامت کے روز لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون کے مقدمات کا فیصلہ ہو گا (مسلم)۔

امام نوویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: چونکہ یہ جرم بڑا سنگین ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اسی کے بارے میں قیامت کے روز باز پرس کرے گا۔ اس حدیث کا اس حدیث سے کوئی تعارض نہیں ہے' جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے نماز کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ حقوق اللہ میں سے نماز اولین اہمیت کی حامل ہے اور حقوق العباد میں انسانی جان کا احترام بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ (امام نوویؒ شرح مسلم' ج ۲' ص ۶۰)

اللہ اور اس کے رسولؐ کے یہ احکام لوگوں کو یاد نہیں رہے۔ اسی وجہ سے مسلمان' مسلمانوں کی گردنیں مار رہے ہیں اور اس بات کا کسی کو کم ہی احساس ہوتا ہے کہ یہ عظیم جرم ہے جس کا بوجھ وہ اپنی گردن پر لے رہا ہے۔ آج ہم اگر اس کی روک تھام کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ ان احکام کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچائیں۔ شاید بھولے سبق یاد آنے سے ان کے ہاتھ قتل ناحق سے رک جائیں۔

منصوبہ بندی اور تنفیذ کا اسلامی اسلوب

طارق نور الٰہی

موجودہ دور میں دعوت اسلامی کا کام کرنے والے افراد اور گروہ اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا ہیں کہ دعوت کا کام' بے جہت اور بے مقصد کوشش اور شغل نہیں ہے۔ منظم باطل پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے منظم جدوجہد کی ضرورت ہے جس کے اہداف واضح ہوں اور جنھیں حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی گئی ہو۔ مثبت نتائج کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں۔ بغیر منصوبہ بندی' بڑے بڑے کام بھی نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ لہٰذا بہترین منصوبہ بندی کرنا' اس پر عمل درآمد کے لیے موثر استعداد بہم پہنچانا' مقصد پر ہمیشہ نظر رکھنا اور اس کے حصول کے لیے جادہ یقین سے وابستہ رہنا' وہ مضبوط بنیادیں ہیں جو کامیابی کا سبب بنتی ہیں۔ یہ سب اللہ کے لیے ہے اور وہی ان اختیار کردہ اسباب سے نتائج پیدا کرنے پر قادر ہے۔ ہمارا یقین و توکل اسی پر ہے' لیکن ضروری استعداد کے حصول کا حکم بھی اسی نے دیا ہے۔ لہٰذا عملی توکل ہی دراصل توکل ہے اور اس سے ہی نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ کی نوید حاصل ہوتی ہے۔

موثر منصوبہ بندی اور اس کے مطابق اقدام کرتے ہوئے ہدف کو حاصل کر لینے کی مثالیں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اللہ میں بہت ہیں۔ ہم یہاں اس کی صرف تین مثالیں پیش کریں گے تاکہ اسلامی انقلاب کے لیے کام کرنے والے اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

ہجرت نبویؐ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ اور گردو نواح کی اصلاح میں بعثت کے تیرہ برس صرف فرمائے لیکن اہل مکہ کی دشمنی بڑھتی گئی۔ لہٰذا آپؐ نے اس سرزمین سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو کر اس عظیم کام کو بجا لانے کی منصوبہ بندی فرمائی۔ اس کے لیے آپؐ عرب کے دیگر علاقوں سے آئے ہوئے حجاج سے دوران حج ملاقاتیں فرماتے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے جس میں جزوی کامیابی بھی ہوئی لیکن سن ۱۱ بعثت نبویؐ میں آپؐ کی کوششوں کی کامیابی کے امکان روشن ہو گئے اور وہ منصوبہ جس پر آپؐ ایک عرصے سے کارفرما رہے تھے' اس کے عملی ظہور کا وقت آگیا۔ وہ اس طرح کہ آپؐ نے مقام عقبہ پر یثرب سے آئے ہوئے چھ افراد کی ایک جماعت کو دعوت اسلام دی۔ ان کو قرآن سنایا۔ نور

ایمان ان کے دلوں کو روشن کر گیا۔ وہ مسلمان ہی نہیں ہوئے بلکہ یثرب میں اس دین کی تبلیغ اور اگلے سال پھر ملاقات کا وعدہ کر گئے۔ یہ سب کے سب خزرج قبیلے سے تھے۔

یہی اصحاب اگلے سال چند دوسرے افراد کے ساتھ پھر حج پر آئے۔ یہ سن ۱۲ بعثت نبویؐ تھا اور حاضر ہونے والوں کی تعداد بھی بارہ تھی۔ اس سال بھی بمقام عقبہ بیعت ہوئی۔ اس سال بیعت کرنے والوں میں دو افراد قبیلہ اوس سے اور باقی خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی یثرب کے دونوں قبائل اس جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلے کے تقاضے کے مطابق حضرت مصعب بن عمیرؓ کو دین کی تعلیم کے لیے یثرب بھجوایا جن کی مساعی سے صرف ایک سال میں اوس و خزرج حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور سن ۱۳ نبویؐ میں بیعت عقبہ کبریٰ کے منعقد ہونے پر مسلمانوں کا وہاں چلے جانا قرار پایا۔ اس سال ۷۳ مرد اور ۲ عورتیں' بیعت کے لیے حاضر ہوئے۔ اسی عقبہ کے مقام پر رات گئے یہ معاہدہ قرار پایا۔ اسلام اور داعی اسلام کی حمایت و نصرت میں جانوں کی بازی تک لگا دینے کے وعدے ہوئے اور رسولؐ اللہ سے ہمیشہ مدینہ رہنے کی خواہش و تمنا کی گئی جسے آپؐ نے بخوشی قبول فرمالیا۔ اسی بیعت کے موقع پر آپؐ نے ان کے قبائل میں سے بارہ نقیبوں کو چنا جو اپنے اپنے لوگوں کے ذمہ دار اور کفیل تھے۔ اس موقع پر حالات متقاضی تھے کہ نصرت اسلام کے لیے مسلم قیادت (لیڈرشپ) بھی ابھر آئے جس سے راہ خدا میں رہنمائی بھی ہوتی رہے اور صف بندی بھی۔ یہاں تک کی منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کے چیدہ نکات ذیل میں لکھے جاتے ہیں:

۱۔ **ہدف کا تعین :** آپؐ نے یہ ہدف مقرر فرمایا کہ مکہ سے کسی ایسی جگہ منتقل ہوا جائے جہاں پرسکون حالات میں اسلام کو پھیلایا جا سکے' جہاں مشرکین کی اذیتوں اور مزاحمت سے بچنے کی صورت ہو۔ اور یہ بھی کہ سارے اصحابؓ سلامتی اور حفاظت کے ساتھ یہاں سے منتقل کیے جائیں۔

۲۔ **تنظیم وسائل :** آپؐ کو جو وسائل میا تھے ان کو آپؐ نے بہت منظم اور بہتر انداز سے استعمال فرمایا اور ہر مرحلے کی عملی ضروریات کو پیش نظر رکھا۔

مدینہ منورہ کو اسلام کا مرکز بنانے کے لیے آپؐ نے ذیل کے حقائق پیش نظر رکھے:

اول : مدینہ ہر لحاظ سے بہترین مقام تھا کیونکہ وہاں کی اکثریت مسلمان ہو گئی تھی اور نصرت کے اس ماحول میں اسلام کی اشاعت کے وسیع امکانات تھے' نیز خواب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بستی دکھائی گئی تھی (سیرت ابن ہشام)۔

دوم : مدینہ جزیرہ نمائے عرب میں اپنے وافر میٹھے پانی' زرخیز زراعتی زمین اور کاروباری منڈی ہونے کے

باعث مشہور مرکزی شہروں میں سے تھا۔

سوم: مدینہ دفاعی نقطہ نظر سے دیگر مقامات سے زیادہ محفوظ مقام تھا۔

چہارم: مدینہ دفاعی نقطہ نظر سے اہم مقام پر واقع تھا جہاں سے مکہ و شام کی شاہراہ کو کنٹرول کرنا آسان تھا۔

پنجم: مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ننھیال بھی تھی۔ اس لحاظ سے قرابت داریاں بھی تھیں۔

ششم: اہل مدینہ عرصے سے یہود کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اس لیے وہ کسی نہ کسی طور دینی اور روحانی زندگی کا مشاہدہ رکھتے تھے اور اسلامی احکامات پر عمل پیرا ہونا ان کے لیے آسان تھا۔

ہجرت کے مقررہ ہدف کو حاصل کرنے کے لیے آپؐ نے دو سال تک پیہم اقدامات اٹھائے اور تینوں سمتوں کو تمہیدی اور تنفیذی مرحلوں کی بنیاد بنا کر تدریجی طور پر قدم بہ قدم منزل مقصود تک بڑھتے چلے گئے اور ہدف حاصل کر لیا:

۱۔ اس کے لیے آپؐ نے ہمہ پہلو دقیق و قابل عمل منصوبہ بندی فرمائی۔

۲۔ آپؐ نے منصوبہ ہجرت پر مرحلہ وار عمل فرمایا اور ہجرت کی تکمیل کے لیے جن جن وسائل کے استعمال سے جو مثبت نتائج مرتب ہو سکتے تھے' ان کو ٹھیک ٹھیک استعمال فرمایا۔

۳۔ آپؐ نے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے حج کے ایام کو منتخب فرما کر ایسا مناسب وقت چنا جو کسی دشمن اسلام کے گمان میں نہ تھا' لہٰذا وہ مقابلے پر کوئی تدبیر نہ کر سکے اور کامیابی سے ہدف حاصل ہو گیا۔

۴۔ آپؐ نے مزید یہ احتیاط ملحوظ رکھی کہ بیعت لینے کے لیے رات ایک تہائی گزر جانے کے بعد کا وقت مقرر کیا تاکہ مشرکین سے الجھنے کے امکانات کم ہو جائیں اور حساسیت کی فضا نہ بننے پائے۔ وقت کے اس انتخاب نے منصوبے کی کامیابی میں معاونت کی۔

۵۔ بیعت عقبہ الکبریٰ پر آپؐ نے بارہ نقیب منتخب کروائے جو ہر قبیلے کے لوگوں نے باہم مشورے سے چنے۔ اس طرح انصار میں اسلامی قیادت و رہنمائی کا ایک نظام مرتب ہو گیا۔

۶۔ بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ آپؐ نے ہر مرحلے کے تقاضوں کا لحاظ رکھا اور ان کو پورا کیا۔ آپؐ نے تدریجی طرز عمل اختیار فرمایا اور بے صبری سے اجتناب برتا باوجودیکہ مکہ کے حالات بہت سخت تھے اور وہاں کے سرداروں نے دعوت کے خلاف ہر نوع کے وسائل استعمال کر رکھے تھے۔ عوام الناس پر جھوٹے پروپیگنڈے کا اتنا دباؤ تھا کہ وہ حق کی پہچان نہ کر پا رہے تھے۔ ضروری تھا کہ اس فضا سے کچھ دیر کو علیحدہ ہوں تاکہ لوگ حق کو جاننے کے قابل ہو کر اسے قبول کرنے پر تیار ہو جائیں۔ ہجرت کے بعد'

سرداران قریش نے چند جنگوں میں اس فضا کو برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور صلح حدیبیہ کے بعد تو مکہ کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔

۷- مکہ سے ہجرت کی ساری منصوبہ بندی وہاں کے حالات کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھی اور اسی اسلوب تنفیذ کو اختیار کیا گیا تھا جو ان حالات میں مفید' کارگر اور نتیجہ خیز تھا۔

۸- بیعت عقبہ اولیٰ میں صرف قبول اسلام پر اکتفا کیا گیا' دوسری بیعت میں ان کے ساتھ ایک داعی مدینہ روانہ کیا گیا جس کے اثرات بہت ہی مفید رہے۔ تیسری بیعت کے موقع پر' جو تمہیدی مرحلے کی انتہا اور تنفیذی مرحلے کی ابتدا تھی' دفاع اسلام پر بیعت لی گئی کہ ضرورت پڑنے پر اہل کفر کو طاقت سے روکا جائے گا۔ پہلی اور تیسری بیعت کے درمیان کا مرحلہ دو سال کی مدت پر محیط ہے۔ اس دوران صبر و حکمت کے ساتھ تدابیر کا اہتمام کیا گیا۔ یہی امور کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔

ہجرت کا تنفیذی مرحلہ : اس مرحلے پر بھی اسی منصوبہ بندی کو پیش نظر رکھا گیا جو ان حالات میں ضروری تھی اور جس پر عمل پیرا ہو کر صحیح اور مکمل نتائج حاصل کیے جا سکتے تھے۔

۱- آپؐ نے مسلمانوں کو اس سفر میں مکمل رازداری برتنے کا حکم دیا۔

۲- ایک ایک کر کے غیر محسوس طریقے سے ہجرت کا حکم دیا' بعض استثنا موجود ہیں جن کے اپنے فوائد تھے لیکن عمومی طور پر ایک ایک کر کے صحابہؓ نے مدینہ ہجرت کی۔

۳- آپؐ نے ہجرت کے دنیاوی نقصان اور اس کی وجہ سے بیوی بچوں تک کو قربان کر کے جانے والے صحابہ کو اجر خداوندی کا یقین دلایا اور صبر و تحمل سے ان شدائد کو جھیلنے کی تلقین کی۔ ان مشکلات میں صحرائی سفر کی مشقت بھی شامل ہو گئی تھی لیکن کوئی رکاوٹ صحابہ کرامؓ کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی۔

۴- حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کو آپؐ نے مکہ میں روکے رکھا۔ ان کے لیے اس منصوبہ ہجرت کے سب سے اہم مرحلے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت میں معاونت کرنا طے کیا گیا تھا۔

سفر ہجرت کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مکہ کے لوگوں کی امانتیں سپرد کیں کہ وہ ان کو لوٹا دیں اور اپنے بستر پر اپنی چادر دے کر رات گزارنے کی ڈیوٹی لگائی۔ پھر تلاوت کرتے اس حالت میں گھر سے نکلے جبکہ باہر عرب قبائل کے چنیدہ جری جوان آپؐ کے قتل کے لیے محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ یہاں سے آپؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر پہنچے اور وہاں سے اگلے مرحلے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس مرحلے میں آپؐ نے ذیل کی احتیاطوں کو ملحوظ فرمایا:

۱- حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر پچھلی جانب سے داخل ہوئے۔

۲- غار ثور (جہاں کچھ عرصہ رکنا تھا) تک جانے کے لیے جنوبی سمت طریق یمن کی جانب سے تشریف

لے گئے کہ اگر کوئی تعاقب کرے گا تو وہ عام راستہ اختیار کرے گا۔ ایسا راستہ اختیار فرمایا جو کسی کے گمان میں نہ ہو۔

۳- تین دن تک غار ثور میں قیام کیا۔

۴- یہ مدت اس لیے مقرر کی کہ اس اثنا میں دشمنان دین تلاش بسیار کے بعد تھک ہار کر بیٹھ جائیں۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ سوائے چند کے جو انعام کا لالچ رکھتے تھے' سب مایوس ہو کر بیٹھ گئے اور آپؐ نے مقررہ مدت میں اطمینان سے سفر ہجرت مکمل کر لیا۔

۵- مدینہ جانے کے لیے وہ راستہ اختیار کیا جو اگرچہ مشکل تھا لیکن ادھر سے لوگ عموماً سفر نہیں کرتے تھے اور وہ مدینہ پہنچنے کا قریبی راستہ تھا۔

۶- سفر میں گائیڈ کے طور پر ماہر ترین شخص کو ساتھ لیا جو گو کہ تاحال مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن کاروباری امانت و رازداری کے لیے معروف تھا۔

۸- اہل مکہ کے منصوبوں سے آگاہ کرنے کے لیے عبداللہ بن ابوبکرؓ کی ذمہ داری تھی جو روزانہ رات کو غار ثور میں ان کی ریشہ دوانیاں بتانے کے لیے آتے۔ یہ اس لیے کہ ضرورت کے مطابق کوئی تبدیلی کرنی پڑے تو ممکن ہو سکے اور دشمن کے ارادوں کی خبر رہے۔

۹- خوراک کی فراہمی کا انتظام عامر بن فہیرہ کے ذمے تھا جو روزانہ غار میں آتے تھے۔ چونکہ یہ غلہ بان تھے اس لیے بکریوں کی آمد کی وجہ سے پاؤں کے نشانات زائل ہو جاتے اور اس دور میں تلاش کا سب سے اہم ذریعہ یعنی پاؤں کے نشانات پر تعاقب کرنا' کسی کے لیے ممکن نہ رہتا۔

یہ تمام احتیاطیں اس کے باوجود کی گئی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی حفاظت اور اسلام کی نصرت کی نوید سنا رکھی تھی۔ لہٰذا ہر داعی کے پیش نظر رہنا چاہیے کہ ایسے حالات جن کا بیان پچھلی سطروں میں ہوا یا اس سے ملتے جلتے حالات میں کامیابی کے صدق یقین کے باوجود' داعی ٹھیک ٹھیک منصوبہ بندی کرے اور اس کے لیے مناسب وسائل فراہم کرے۔ وہ ان وسائل کے بہترین استعمال سے آشنا ہو اور تمہید و تنقید کے ہر مرحلے میں صبر و حکمت کا دامن نہ چھوڑے اور ظاہری اسباب کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ پر مکمل توکل رکھے۔ رسول کریمؐ نے ان امور کا التزام فرمایا اور مسلمان بحفاظت مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ پھر کفر کی ایک نہ چلی اور سن ۸ ہجری میں مکہ سمیت پورا عرب اسلام کے زیر سایہ آگیا اور اگلے سالوں میں دو سپر پاور قیصر روم و کسریٰ ایران بھی اسلام سے مغلوب ہو گئیں۔ اگر ہمہ جہت اور دور رس منصوبہ بندی نہ کی جاتی اور اس پر مسلسل مربوط عمل جاری نہ رکھا جاتا' مزید پیش آمدہ مشکلات کے حل نہ تلاش کیے جاتے تو یہ کامیابیاں ممکن نہ ہوتیں۔ مسلمانوں نے جب بھی ان امور پر توجہ دی ہے' کامیاب رہے ہیں لیکن اب یہ

پہلو کمزور ہونے کے باعث باوجود کثرت عدد کے مسلمانوں کی اہمیت اور وقعت کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان دین کی سربلندی کے لیے کوشاں ہو جائیں اور حالت ضعف کو قوت میں بدلنے کے لیے ایسی موثر قیادت پیدا کریں جو حالات کو جانتی ہو' انھیں درست کرنے کی نظری و عملی قوت سے مالا مال ہو' خیر خواہی کا جذبہ رکھتی ہو' قربانی کر سکتی ہو اور دشمنان اسلام کی چالوں کو سمجھتی اور ان کو رد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

حضرت یوسفؑ کی منصوبہ بندی: دوسری مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے جس میں ایسی شاندار منصوبہ بندی اور اس کی بہترین تنفیذ کی گئی ہے کہ ایک تباہ ہوتی قوم کو مشکل سے نکال کر حیات نو کا سامان کر دینے کے تمام احکامات و طریقے معلوم ہو جاتے ہیں۔

مصر کے بادشاہ کو نظر آنے والے خواب کی تعبیر میں حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ سات سال تک بغیر انقطاع فصل اگاتے چلے جاؤ۔ ان برسوں میں حاصل ہونے والی فصل کے استعمال کے لیے آپ نے یہ منصوبہ بتایا کہ جو فصل حاصل ہو' اسے بالیوں ہی میں رہنے دو تاکہ موسمی اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے۔ اس میں سے حسب ضرورت تھوڑی مقدار میں اپنے کھانے کے لیے لے لو۔ وہ تمھاری غذا اور اس کا بھوسا تمھارے جانوروں کی غذا ہو گا۔ یہ محفوظ فصل آنے والے قحط زدہ سالوں میں کام آئے گی۔ یہ مدت چھوٹی نہیں۔ سات برسوں پر مشتمل ہو گی۔ اس کے بعد نعمتیں دوبارہ حاصل ہو جائیں گی۔

بادشاہ' حضرت یوسفؑ کی تعبیر خواب سے ان کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا اور حضرت یوسفؑ برات کے بعد جب قید سے نکلے تو بادشاہ نے ملنے کی خواہش کی۔ "بادشاہ نے کہا انھیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں۔ جب یوسفؑ نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا: "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا بھروسہ ہے۔ یوسفؑ نے کہا: "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے' میں حفاظت کرنے بھی والا ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔ اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسفؑ کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں' نوازتے ہیں۔ نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا"۔ (یوسف ۱۲: ۵۴ تا ۵۶)۔

حضرت یوسفؑ کی تعبیر اور منصوبہ بندی کے مطابق ان تمام برسوں میں کام ہوتا رہا۔ انھوں نے اپنی نگرانی میں ایسا بہترین نظام وضع کیا جس سے بھوک سے مرنے کے قریب قوم قحط سالی اور ہلاکت سے بچ گئی اور اردگرد کے علاقوں کو بھی اناج دینے کے قابل بن گئی۔ اس طرح تمام قحط زدہ سالوں میں مربوط انداز سے غذائی ضروریات یوسف علیہ السلام کے حسن تصرف سے ممکن ہو گئیں۔

حضرت یوسفؑ نے منصوبہ عمل پیش ہی نہیں کیا بلکہ اس پر خود بھی عمل کیا اور حکمران و افواج پر بھی

اس کی تنفیذ فرمائی۔ آپ خود بھی بھوک رکھ کر کھاتے' بادشاہ وقت' اس کے کارکنان (بیوروکریسی) اور افواج بھی بھوک رکھ کر کھاتے۔ سب روزانہ صرف دوپہر کے وقت کھانا کھاتے تھے۔ یہ طرز عمل صرف اسلامی منصوبہ بندی میں سامنے آتا ہے کہ منصوبہ ساز خود بھی اس پر کاربند رہتا ہے اور حاکم و محکوم میں فرق روا نہیں رکھا جاتا بلکہ قائد سب سے بے خود عملی مثال بنتا ہے (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق میں اپنے پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے تھے)۔ یہی مشترکہ طرز عمل اپنانے پر اتنا بڑا قحط مصری قوم کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ آپ نے جو منصوبہ عمل پیش فرمایا اس میں تمام عواقب کا ادراک کیا گیا تھا اور ان سے نپٹنے کی تدابیر کی گئی تھیں اور ہدف تک پہنچنے کے تمام ضروری وسائل اختیار کیے گئے تھے جس کا نتیجہ سو فیصد حاصل ہوا۔ چند ضروری نکات ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ طویل مدت تک عمل کی ضرورت بتائی اور اناج ذخیرہ کرنے اور صرف کرنے کے لیے مدت کا تعین کیا۔

۲۔ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش اور ضرورت پر متوجہ کیا۔

۳۔ اناج کی بہترین حفاظت کا طریقہ بتایا اور اس کے استعمال میں اسراف سے منع کیا۔

۴۔ اس سارے عرصے میں مسلسل جدوجہد جاری رکھنے اور کسی تساہل یا مایوسی کو قریب نہ پھٹکنے دینے کی تلقین کی۔

اس منصوبہ بندی اور حسن تدبیر سے جو حضرت یوسفؑ نے فرمائی' مصری قوم بھوک کے ہاتھوں ہلاکت سے بچ گئی اور بھوک و پیاس اور قحط سالی کے ایام میں تمام غذائی ضروریات بخوبی پوری ہوتی رہیں بلکہ دوسروں کی مدد کرنے کے قابل ہو گئے۔ سات سال بعد باران رحمت ہوئی اور باغات و کھیتیاں پھر پھلنے پھولنے لگیں۔

اس مثال سے معلوم ہوا کہ انسان موجود وسائل کا صحیح استعمال کر کے سوچے سمجھے طریقے سے ان میں تصرف کر کے وہ نتائج پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو اسے مشکلات سے بچا سکیں۔

قرآن نے اس مثال کو بیان فرما کر منصوبہ سازی کے لیے راستے کھول دیے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف تخمینوں کے کھیل اور بے عملی پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ ہر طرح کی مشکل میں قابل عمل منصوبہ بندی کرنے' اس پر یکسوئی سے عمل پیرا ہونے اور ہدف حاصل کرنے کے صد فی صد کامیاب اسالیب سے روشناس کرواتا ہے۔

ذوالقرنین کی مثال : آخری مثال ایک صالح حکمران کی ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ اس حکمران نے ایک مردہ قوم میں روح عمل ڈال کر انھیں سوتے سے جگا دیا اور وہ زندہ قوم بن گئے۔ یہ نیک

حکمران ذوالقرنین ہیں جنھیں اللہ نے زمین میں ایسی تمکنت دی تھی کہ ساری دنیا ان کے تصرف میں تھی لیکن طرز حکمرانی قرآنی تھا۔

قرآن نے ذوالقرنین کے تین سفر بتائے ہیں۔ ان میں آخری سفر (بین السدین) میں اس کے طرز عمل اور اس سے حاصل ہونے والے مثبت نتائج سے بحث کرنا یہاں مقصود ہے۔ اس سفر کا سورۂ کہف آیت ۹۲ تا ۹۸ میں ذکر ہے: "پھر اس نے (ایک اور مہم کا) سامان کیا یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی، ان لوگوں نے کہا: "اے ذوالقرنین! یاجوج ماجوج اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں، تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟ اس نے کہا: "جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے تم بس محنت سے میری مدد کرو، میں تمھارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں، مجھے لوہے کی چادریں لا دو۔ آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا اب آگ دہکاؤ حتیٰ کہ جب (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سرخ کر دی تو اس نے کہا لاؤ اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں گا (یہ بند ایسا تھا) کہ یاجوج ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آ سکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے"۔

اس سفر میں اس کا واسطہ ایک جاہل اور بے عمل قوم سے پڑا۔ اس کے قریب ایک مفسد اور ظالم قوم یاجوج ماجوج رہتی تھی جو گاہے بگاہے ان پر حملہ آور ہوتی تھی لیکن یہ قوم خود آشنائی سے محروم تھی۔ جانتی تو تھی کہ اگر دونوں پہاڑوں کے خلا کو پر کر دیا جائے تو اس مصیبت سے چھٹکارا مل سکتا ہے جو یاجوج ماجوج کی شکل میں نازل ہوتی رہتی ہے لیکن یہ خود عملی قدم اٹھانے سے محروم تھی۔ ذوالقرنین کی صورت میں جب مسیحا مل گیا تو کہا کہ ٹیکس لے لیجیے اور ہمیں ان سے بچا لیجیے۔ لیکن ذوالقرنین جو مظلوم کا حامی و مددگار تھا جسے اللہ جل شانہ نے پہلے سے بے بہا شان و شوکت دے رکھی تھی وہ اس ٹیکس سے فائدہ اٹھانے کا روادار نہ تھا۔ اس نے اس قوم کی مایوسی اور بے عملی کو ختم کرنے کے لیے ایسا منصوبہ تجویز کیا جو انھیں حیات نو دے گیا۔ اس نے کہا تم محنت سے میری مدد کرو۔ خود جدوجہد میں شامل ہو کر مثبت طرز عمل کا مظاہرہ کرو۔ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ اس طرح ان کی قوت بشری مثبت کام پر لگ گئی۔ اس نے بند باندھنے کے لیے خام مواد کے حصول پر انھیں لگایا تو ان لوگوں نے زمینی خزانوں کو چھان کر لوہا تلاش کیا۔ اس کی دیوار بنائی، اس کے گرد آگ روشن کی، تانبے کو گرم کیا اور اس مرحلے پر ذوالقرنین نے خود اس تانبے کو لوہے کی دیوار میں انڈیلا۔ ذوالقرنین نے ان کی پوشیدہ بلکہ مردہ صلاحیتوں کو جگا کر اس قوم کی کایا پلٹ دی۔ شکستہ عزم بحال ہو گئے اور جو خواب ان کے پیش نظر تھا، وہ مجسم صورت اختیار کر گیا اور نہ صرف ان کی بلکہ دنیا کی،

مفسد قوم یاجوج و ماجوج سے' نجات کا سامان ہو گیا۔ یہاں ایک مسلمان حکمران کا صحیح طرز عمل واضح ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ کن صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہیے اور ان صلاحیتوں کو عمل میں لا کر وہ کیا کیا معجزات مرتب کر سکتا ہے اور کروا سکتا ہے' اور یہ بھی کہ وہ ہمیشہ اللہ کا تابع فرمان اور شکرگزار رہتا ہے۔ کفران نعمت نہیں کرتا (قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي.....)۔

قرآن نے یہاں یہ بتایا ہے کہ ایک شکست خوردہ قوم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر ناممکن کو ممکن کس طرح بنا سکتی ہے۔ کس طرح اپنی قوت عمل سے آگاہ ہو سکتی ہے' اپنی ضروریات کو خود مہیا کر سکتی ہے' اپنے دفاع پر خود قادر ہو سکتی ہے۔ غرض اپنے سب مسائل کو خود حل کر سکتی ہے۔

قرآن اس کا حل ایک صالح' باعمل' دور اندیش اور باکردار قیادت بتاتا ہے۔

اوپر بیان ہونے والے تینوں مثالیں مختلف صورت حال میں بہترین طرز عمل کی نمایندگی کرتی ہیں جن سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ قرآن و سنت ہر قسم کے احوال میں مثبت' موثر اور قابل عمل منصوبہ بندی کے واضح قواعد بھی دیتا ہے اور ان اصول و قواعد پر عمل پیرا ہو کر صد فی صد کامیابی حاصل کرنے کی عملی مثالیں بھی پیش کرتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لائحہ عمل کی ترتیب و تنفیذ و تشکیل میں ان مثالوں کو ہم بھی پیش نظر رکھیں۔ اس وقت مسلم عوامی قوت کو مجتمع کر کے نفاذ شریعت الٰہی کی کوشش جاری ہے اور اس کی کامیابی پر باذن اللہ وطن عزیز کی کایا پلٹ سکتی ہے اور عالمی سازشوں کے خلاف بند باندھا جا سکتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اللہ کے فضل پر نظر رکھیں اور اس کی دی ہوئی قوت فکر و عمل کو بہترین منصوبہ بندی سے استعمال کرتے ہوئے کامیاب بنانے میں لگے رہیں۔

مضمون کی تیاری میں ان عربی کتب سے استفادہ کیا گیا: ۱۔ التخطيط والتخطيط (محمد عبداللہ الخطیب)' ۲۔ فقه السيرة (محمد الغزالی)' فقه السيرة النبوية (ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی)

۹۴' ۹۵' ۹۶' ۹۷ کے ۴۸ شمارے ۸ جلدوں میں

ترجمان القرآن کے گزشتہ ۴ سالوں کے شمارے' دیدہ زیب مجلد شکل میں دستیاب ہیں۔

فی جلد ۷۰ روپے۔ مکمل سیٹ۔ /۵۰۰ روپے۔ رعایت ۶۰ روپے

لائبریریوں کے ذمہ دار اور اہل ذوق توجہ فرمائیں۔ (ڈاک خرچ بذمہ خریدار)

مینیجر ترجمان القرآن 5-اے ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور

لٹریچر کا روزانہ کچھ نہ کچھ مطالعہ اپنی عادت بنائیے!

مغربی تہذیب کی یلغار کا مقابلہ اور اہم مسائل

سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ

امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل

ترتیب: خلیل احمد الحامدی

ملک بھر کے تحریکی مکتبوں سے حاصل کیجئے

Ejaz Chaudhry :

عطیہ اشتہار

SEARS International

COMPUTERS, PRINTERS, MONITORS & FAX MACHINE

58, First Floor, Hafeez Centre, Gulberg III, Lahore. Pakistan.

Tel: 92-42- 5752247-48 Fax: 92-42-5752249

آپ دنیا میں کسی بھی جگہ ہوں!

مجاہدین اور مہاجرین کے لیے قربانی کر سکتے ہیں

جماعت اسلامی پاکستان نے آپ کی سہولت کے لیے کشمیری مجاہدین اور مہاجرین کے لیے اندرون کشمیر اور آزاد کشمیر میں' نیز افغان اور تاجک مہاجرین کے لیے عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کا انتظام کیا ہے۔ درج ذیل شرح سے ڈرافٹ بنام مسعود احمد خان ارسال کیجئے۔

	پاکستانی روپے	امریکن ڈالرز	برطانوی پاؤنڈ	سعودی ریال
بکرا /دنبہ	2500	55	35	210
گائے کا حصہ	1500	35	20	125

رقوم 8 ذی الحجہ تک موصول ہو جائیں

رقم میں تاخیر کی صورت میں فون /فیکس /ای میل کے ذریعے پیشگی اطلاع ضرور دیجئے۔

نوٹ: اندرون کشمیر بکرے کی قربانی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

قاضی حسین احمد ۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان منصورہ' ملتان روڈ' لاہور

فون: 7844605-9 ,5419520-24(042)' فیکس: 7832194(042)(92)

EMail:amir@JI.org.pk.

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی یاد میں

(دوسری اور آخری قسط)

خورشید احمد

برصغیر کی حد تک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی دونوں اپنے اپنے طور پر ایک مشترک فکر اور منہج تک پہنچے اور پھر دونوں نے مل کر اس تصور دین کی بنیاد پر ایک فکری اور اجتماعی تحریک کی آبیاری اور قیادت کی۔ جماعت اسلامی کی انقلابی دعوت اور ساری دنیا میں اسلامی احیا کی تحریکوں کا یہی پیغام ہے۔

چند اختلافی امور کی وجہ سے ۱۹۵۸ میں جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد بھی مولانا اصلاحی نے اسی فکر اور اسی منہج کی ترویج کے لیے اپنی زندگی وقف کی اور آخری لمحہ تک اس کی شہادت دیتے رہے۔ جماعت سے ان کا استعفا ایک سانحہ تھا اور مولانا اصلاحی نے ان امور کا بھی برملا اظہار کر دیا ہے جن کی وجہ سے وہ جماعت سے مستعفی ہوئے' نیز دوسرے موقف کے بارے میں بھی مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے لٹریچر میں تمام ضروری پہلو آگئے ہیں اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس وقت نہ ان کا اعادہ مقصود ہے نہ محاکمہ۔ البتہ اس حقیقت کی نشاندہی مطلوب ہے کہ ان اختلافات کا تعلق تصور دین اور تحریک کے بنیادی پیغام اور طریق کار سے نہ تھا۔ ۱۹۵۶ سے ۱۹۵۸ تک کے فیصلہ کن دور میں' میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں سے بہت قریب تھا۔ یہ دونوں بزرگ اپنی شفقت میں ایک خورد سے ساتھی اور رفیق کی طرح معاملہ کرتے تھے۔ ماچھی گوٹھ کے اجتماع اور مئی ۱۹۵۷ کی کوٹ شیر سنگھ کی شوریٰ میں مجھے ایک قابل لحاظ کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ چودھری غلام محمد صاحب کے ساتھ میں تقریباً تمام ہی اہم ملاقاتوں میں شریک رہا۔

ماچھی گوٹھ میں جب مسائل کے حل اور امیر جماعت اور شوریٰ کے اختلافات کے درمیان نقطہ اعتدال و اتفاق تلاش کرنے کے لیے ایک مجلس مشاورت منتخب ہوئی تو دونوں بزرگوں نے کمال عنایت سے مجھے اس مجلس کا سب سے نوعمر رکن ہونے کے باوجود اس کا صدر مقرر کیا۔ جو قرارداد یں پالیسی اور پھر مستقبل کے

جماعت کے دستوری نظام کے بارے میں طے ہوئیں ان کو مرکزی شوریٰ اور اس مجلس مشاورت کے درمیان اتفاق رائے سے تیار کیا گیا تھا۔ مجھے یہ نازک ذمہ داری ادا کرنی پڑی کہ شوریٰ کے ارکان اور خصوصیت سے مولانا امین احسن اصلاحی اور پھر مولانا مودودی اور اس مجلس مشاورت، جسے مولانا مودودی نے اعتماد میں لے کر اپنی مشکلات سے آگاہ کیا تھا، کے درمیان شٹل کاک (پیغام رساں) کا رول ادا کروں تاکہ سب کے مشورے سے کوئی متفق علیہ لائحہ عمل مرتب کیا جا سکے۔

آج اس حقیقت کو بھی ریکارڈ پر لاتا ہوں کہ اس پورے عمل میں دونوں کے مشورے سے اور دونوں کے اعتماد کے ایک اور بزرگ نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا اور وہ تھے مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم۔ وہ اس پورے عرصے ماچھی گوٹھ ہی کے ایک کمرے میں مقیم رہے، ہم سب بار بار ان سے مشورہ کرتے تھے اور وہ اتفاق کی راہیں نکالنے میں مدد دیتے تھے۔ دوسرے اختلاف کرنے والوں کی بات مختلف ہے--- اور شیخ سلطان احمد صاحب، حکیم محمد اشرف صاحب، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ارشاد احمد حقانی صاحب، ہر ایک کا اپنا اپنا نقطہ نظر تھا اور شکایت کی وجوہ بھی۔ لیکن مولانا اصلاحی کی حد تک میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں وہ کم از کم اس وقت فی نفسہ جماعت کی جانب سے قومی انتخابی عمل میں شرکت کے مخالف نہ تھے۔

مولانا اصلاحی کا صرف یہ اصرار تھا کہ مناسب تیاری کے لیے وقت درکار ہے اور ابھی زمین اتنی تیار نہیں ہے کہ اس عمل کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ اس لیے مسئلہ صرف یہ نہیں کہ انتخاب میں حصہ بلاواسطہ لیا جائے یا بالواسطہ، بلکہ یہ کہ کب حصہ لیا جائے اور کب تک نہ لیا جائے۔ بالآخر ہمارے درمیان جس آخری مسودے پر اتفاق ہوا تھا، اس میں ایک جزوی ترمیم کا، جو اجتماع ارکان میں پیش کیے جانے کے بعد کی گئی انھیں افسوس تھا۔ یہ قرارداد ۱۵ کے مقابلے میں ۹۲۰ ارکان کی تائید سے منظور ہوئی۔

رہا دوسرا مسئلہ یعنی امیر اور شوریٰ کے تعلق کا، تو اسے کم از کم مستقبل کے لیے باہم مشورے سے طے کر لیا گیا تھا اور جو حضرات شوریٰ سے ان کے واک آؤٹ کرنے کی بات کرتے ہیں، وہ حقائق کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔ شوریٰ والا مسئلہ بالکل نیا نہیں تھا۔ جماعت کا جو دستور تاسیس کے وقت بنایا گیا تھا اس میں شوریٰ کے بارے میں کوئی بات نہیں تھی۔ جب کام آگے بڑھا تو شوریٰ کی ضرورت محسوس ہوئی اور شوریٰ قائم بھی ہو گئی۔ لیکن آیا شوریٰ کا فیصلہ حتمی ہو گا یا امیر کو ویٹو کا حق حاصل ہے، اس پر مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے درمیان اصولی اختلاف تھا۔ مولانا مودودی نے اسلام کا سیاسی نظریہ میں بھی امیر کے ویٹو کی بات کی ہے اور بعد میں جماعت کے دستور میں تدبیر کے معاملات اور شرعی رائے میں فرق کیا گیا۔ اول الذکر میں شوریٰ کو اور ثانی الذکر میں امیر کو فوقیت دی گئی۔ نیز اگر اول الذکر کے سلسلے میں اختلاف ناقابل سمجھوتہ ہو تو ارکان سے استصواب اور جس کے حق میں ارکان کا استصواب ہو اس کے مخالف رائے والے کے استعفے

کی شق (provision) رکھی گئی۔ یہ تمام ترمیمات دونوں بزرگوں کے اتفاق رائے سے ہوئیں۔

اس پس منظر میں ماچھی گوٹھ اور کوٹ شیر سنگھ میں منعقد ہونے والی شوریٰ میں اس امر پر اتفاق رائے ہوا کہ جماعت چلانے کی آخری ذمہ داری امیر جماعت کی ہوگی' پالیسی سازی شوریٰ کرے گی اور اس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ البتہ امیر کو اگر بہت بنیادی اعتراض ہو تو شوریٰ مابعد تک فیصلہ کو موخر کرا سکتا ہے' اور مابعد کی شوریٰ کا فیصلہ سب کے لیے حتمی ہوگا۔ یہ تمام باتیں گھنٹوں اور دنوں مشاورت کے بعد طے ہوئیں اور ماچھی گوٹھ کی قرارداد اور ۱۹۵۷ کے دستور میں موجود ہیں۔ ان تمام امور پر مولانا اصلاحی کا مکمل اتفاق تھا۔ دستور مولانا کی موجودگی میں منظور ہوا اور صرف ایک شق ۳۴ (۶) پر جس کا تعلق عاملہ کے اختیارات سے تھا' اختلاف ہوا۔ بلاشبہ مولانا اصلاحی نے ۱۹۵۶ کی شوریٰ کے چار ارکان سے استعفیٰ طلب کرنے کے مسئلے پر مولانا مودودی سے سخت اختلاف کیا تھا جو اس زمانے کی خط و کتابت میں موجود ہے--- لیکن مستقبل کے لیے اور پھر ۱۹۵۷ کے دستور کی تسوید کے موقع پر امیر اور شوریٰ کے اختیارات کے سلسلے میں تمام فیصلے باہم رضامندی اور اتفاق رائے سے ہوئے' البتہ باہمی اعتماد کو جو ٹھیس لگ گئی تھی بالآخر جدائی کا سبب بنی۔

جہاں تک معاملہ علمی اختلافات کا ہے تو وہ پہلے بھی رہے ہیں۔ اگر ترجمان القرآن کی فائلوں کا مطالعہ کریں تو پردہ کے مسئلے پر دونوں کے درمیان اختلاف مطبوعہ مضامین میں موجود ہے۔ پھر مسلم قومیت اور اسلامی قومیت کے مسئلے پر صرف غلط فہمی کی بنیاد پر تشکیل جماعت سے پہلے اختلاف رونما ہوا جو الاصلاح میں موجود ہے۔ بعد میں حکمت عملی اور قریشیت کے مسئلے پر بھی اختلاف ہوا اور حدیث سے متعلق چند تفصیلی پہلوؤں اور رجم وغیرہ کے بارے میں بھی دونوں کے نقطہ نظر میں نمایاں فرق ہے۔ لیکن ان سب کی حیثیت علمی آرا میں اختلاف کی ہے جو ہمارے علما کی زرین روایت کا حصہ ہے اور جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن

میں نے اس وقت ان اختلافی امور کا ذکر جس وجہ سے کیا ہے وہ صرف ریکارڈ درست کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اس حقیقت کا اظہار کرنے کے لیے ہے کہ ایسے اختلافات کے باوجود اور ایک مختصر عرصے میں خطوط کے قلمی مباحثے کے علی الرغم دونوں بزرگوں میں اور جماعت اسلامی اور مولانا اصلاحی کے درمیان اعتماد اور قدر دانی کا رشتہ موجود رہا۔ جماعت اسلامی کے کارکن مولانا اصلاحی کے لٹریچر سے پہلے کی طرح استفادہ کرتے رہے اور وہ ان کے علمی اور تربیتی نصاب کا حصہ رہا اور ہے' جس طرح مولانا اصلاحی کے اجتماعی دور میں تھا۔ اور مولانا اصلاحی جماعت چھوڑنے کے بعد بھی اسی بنیادی فکر کی ترقی اور ترویج کے لیے سرگرم عمل رہے اور تدبر قرآن' تزکیہ نفس' دعوت دین اور اس کا طریق کار' اسلامی ریاست' تفہیم

دین' اسلامی قانون کی تدوین' اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' فلسفہ کے بنیادی مسائل' قرآن حکیم کی روشنی میں' مبادی تدبر حدیث' مبادی تدبر قرآن جیسی قیمتی کتب' کچھ نئی اور کچھ نظرثانی اور اضافوں کے ساتھ' طالبان حق کے لیے رشد و ہدایت کا سامان فراہم کرنے کا ذریعہ رہیں۔ جماعت کی قیادت میں مولانا اصلاحی کا احترام اور ان سے استفادے کا شوق اسی طرح رہا اور مولانا اصلاحی نے جماعت کو چھوڑنے کے بعد بھی اس کو اپنی ہی جماعت سمجھا اور تنقید و احتساب کے علی الرغم اپنا سمجھا۔

۱۹۸۶ میں جناب مصطفیٰ صادق صاحب سے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

میں جماعت اسلامی کو اپنی جماعت کہتا ہوں۔ میں سترہ سال اس کے ساتھ رہا ہوں۔ آج بھی آپ سے سچ کہتا ہوں کہ ان کی فتح کو اپنی فتح اور ان کی شکست کو اپنی شکست سمجھتا ہوں۔ یہی ایک جماعت تھی جس سے آپ احقاق حق اور ابطال باطل کی توقع کر سکتے تھے اور امید بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں۔ (وفاق اور تکبیر' جلد ۸' شمارہ ۲' ۲۹ مئی ۱۹۸۶)

مولانا اصلاحی ۱۹۵۸ میں جماعت سے مستعفی ہوئے۔ ۱۹۹۸ تک جب میں انگلستان منتقل ہوا' ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ حسب سابق شفقت اور رہنمائی فرماتے رہے۔ میں نے اور چودھری غلام محمد صاحب نے ایس ایم کالج کراچی میں اسلامی قانون کی تدوین پر ان کے لیکچرز کا اہتمام کیا اور انھوں نے کمال شفقت سے یہ لیکچرز دیے۔ ان میں سے دو ماہنامہ چراغ راہ کراچی کے اسلامی قانون نمبر میں شائع ہوئے۔ ۱۹۶۴ میں جماعت پر پابندی لگی اور ہم سب گرفتار ہوئے تو مولانا اصلاحی بے چین ہو گئے۔ وہ اسی طرح مضطرب رہے جس طرح جماعتی دور میں ہوا کرتے تھے۔

ستمبر ۱۹۷۹ میں مولانا مودودی کا انتقال ہوا تو منصورہ تشریف لائے۔ میں مولانا مودودی کے جسد خاکی کے ہمراہ آیا تھا اس لیے اشکبار آنکھوں کے ساتھ مجھ سے کرید کرید کر سوالات کرتے رہے۔ کئی بار فرمایا "آج میرا یار چلا گیا"۔ صحافیوں نے مولانا مودودی کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ "ان کے مقام کو آپ کیا جانیں۔ ایک مزاج شناس رسول جدا ہو گیا"۔ مجھ سے ہی نہیں متعدد افراد سے فرمایا: "آپ لوگوں کو کیا معلوم کہ مودودی کیسا انسان تھا۔ اب ایسے لوگ کہاں۔ ان سے تو اتفاق کرنے میں بھی مزہ تھا اور ان سے اختلاف کرنے میں بھی لطف آتا تھا"۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چودھری غلام محمد صاحب اور میں جب انھیں جماعت میں رکھنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے تو کس طرح بار بار انھوں نے جماعت ہی سے نہیں مولانا مودودی سے بھی اپنے قلبی تعلق کا ذکر کیا اور اپنے مخصوص انداز میں شوریٰ کے اجلاسوں کا ذکر کیا۔

ایک موقع پر چودھری غلام محمد صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے دور کے شوریٰ کے کچھ ارکان کے اظہار خیال کے انداز کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا:

"کچھ لوگ میری طرح جرات اور بے باکی سے، کچھ باقر خاں کی طرح ڈپلومیسی اور ہوشیاری سے، کچھ وصی مظہر کی طرح دستوری اور قانونی نکتہ سنجی کی شکل میں، کچھ ملک صاحب (ملک نصراللہ خاں عزیز) کی طرح کبھی حکمت سے اور کبھی ظرافت سے، کچھ عبدالجبار غازی کی طرح صفائی اور بردباری سے اور کچھ آپ (چودھری غلام محمد صاحب) کی طرح ادب اور نیاز مندی سے اپنی بات کہتے تھے"۔

یہاں مولانا اصلاحی نے دو دو لفظوں میں ہر شخص کی پوری شخصیت اور اس کے انداز کلام کا جوہر بیان کر دیا ہے، جس سے ان کی انسان شناسی اور شوخی بیان دونوں کا پتا چلتا ہے۔

مولانا اصلاحی کے الاصلاح کے دور کے ساتھی گواہی دیتے ہیں کہ جس زمانے میں ان کا قومیت کے مسئلے پر مولانا مودودی سے اختلاف چل رہا تھا تو اس وقت بھی وہ نہ صرف یہ کہ مولانا مودودی کی بے حد عزت کرتے تھے بلکہ لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ ان کی تصانیف کا مطالعہ کریں کیونکہ ان کی نگاہ میں اسلام پر ان سے بہتر لٹریچر اس دور میں کسی نے نہیں لکھا۔ نیز بقول ان کے ایک شاگرد، اصلاحی صاحب نے فرمایا "اگر اسلام کو سمجھنا چاہتے ہو تو مودودی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ اگر دین کی کچھ قلمی خدمت کرنا چاہتے ہو تو ان کے داعیانہ طرز تحریر کو اپناؤ"۔ یہی رویہ ان کا آخر دم تک رہا۔ اسی طرح مولانا مودودی، مولانا اصلاحی کے علمی مقام اور فہم قرآن کے باب میں ان کی خدمات کے بے حد مداح تھے اور ان کے افکار اور ان کی کتب سے استفادہ کا مشورہ دیتے تھے اور ان کا ذکر آخیر وقت تک عزت اور محبت سے کرتے رہے۔ یہاں یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ جب ۱۹۵۳ میں مولانا مودودی کو سزائے موت دی گئی ہے اور ان کو جیل کے اس حصہ میں منتقل کیا گیا ہے جو پھانسی کی کوٹھڑی (death cell) کہلاتا ہے تو مولانا اصلاحی کی کیفیت دیکھنے کے لائق تھی۔ جب مولانا مودودی کے کپڑے "پھانسی کی کوٹھڑی" سے بھیجے گئے ہیں اور ان کو سزائے موت کے "مجرموں" کے کپڑے پہنائے گئے ہیں تو مولانا اصلاحی نہ صرف اشکبار ہو گئے بلکہ ایک لمحے کے لیے ان کپڑوں کو چوم لیا۔ جب میں نے بعد میں مولانا اصلاحی سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا تو بڑی پیاری بات کہی۔ فرمایا: خورشید میاں! یہ فقہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ جب مجھے مودودی صاحب کے لیے سزائے موت کی اطلاع ملی ہے تو میں چونک پڑا اور دل نے کہا سبحان اللہ! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مودودی کا مقام اتنا بلند ہوتا ہے کہ وہ کلمہ حق کہنے پر سولی پر چڑھایا جائے گا۔ پھر دل نے کہا کہ مودودی کو یہ لوگ پھانسی نہیں دے سکتے۔ اگر کہیں ایسا ہو جاتا تو نہ معلوم اس قوم پر کیسا عذاب نازل ہوتا۔

یہ صحیح ہے کہ چند سیاسی اختلافات کی بنا پر مولانا اصلاحی نے جماعت سے رکنیت کا رشتہ منقطع کر دیا تھا مگر ان کی ساری زندگی اسی مقصد کے لیے علمی، دعوتی اور تعلیمی کام کرتے گزری اور اس طرح جوہری اعتبار سے وہ اسلامی تحریک ہی کی خدمت میں ساری زندگی مصروف رہے۔ شاید اللہ تعالیٰ کو اسی رمز کا شعور دلانا

مطلوب تھا کہ مولانا اصلاحی کے ورثا کی خواہش پر ان کی نماز جنازہ محترم قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی نے پڑھائی اور جماعت کے قائدین اور کارکنوں نے اپنے کو دوسری بار یتیم ہوتے محسوس کیا۔

اس پورے معاملے میں امت کی علمی اور تہذیبی روایت کی ایک اور نشانی بھی دیکھی جاسکتی ہے جس کا ذکر اقبال نے بھی بڑی بصیرت سے کیا ہے یعنی علما اور فقہا کے درمیان اختلافات جن کا اظہار کبھی شدید ترین انداز میں بھی ہوا' لیکن اس کے ساتھ ایک دوسرے کا احترام اور اپنے شاگردوں کو انھی علما اور اساتذہ سے استفادے کی ترغیب جن سے اختلاف کیا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے امت کے زوال کے ادوار میں یہ روایت ختم ہو گئی لیکن ہمارے اپنے دور میں ان دونوں بزرگوں کے تعامل نے اعتدال' رواداری' ایک دوسرے کے اعتراف اور مخلصانہ تعلق خاطر کی اس شاندار روایت کو ایک بار پھر تازہ کر دیا--- اللہ کی رحمتیں ہوں ان سعید روحوں پر!

مولانا کے علمی مقام اور تحریکی خدمات پر تو بہت کچھ لکھا جائے گا اور کوئی شبہ نہیں کہ ؏

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ انھیں

لیکن اس وقت کچھ باتیں ان کی ذات کے بارے میں بھی لکھنا بے محل نہ ہو گا۔ ۱۹۵۱ سے ۱۹۹۸ تک مجھے درجنوں بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ جتنا ہم ان کے علم سے مرعوب تھے' اتنا ہی انھوں نے اپنی محبت' شفقت اور بے تکلفی سے ہمیں اپنے سے مانوس کر لیا تھا۔ جمعیت کے زمانے میں وہ ہم سے اپنی اولاد کی طرح معاملہ کرتے۔ بڑے چھوٹے کا ذرا فرق نہ کرتے۔ ہم سے کھل کر بات کرتے۔ ضرورت پڑے تو بلاتکلف سرزنش بھی فرماتے لیکن ایسی اپنائیت کی فضا میں بات کرتے اور اتنا بے تکلف ہو جاتے کہ ہم اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتے۔ خرم' ظفراسحاق' اسرار اور مجھ سے غیر معمولی شفقت فرماتے اور بڑی قدر افزائی کرتے۔ وہ ہفت روزہ اسٹوڈنٹس وائس کا شوق سے مطالعہ کرتے اور ہمارے تصویریں چھاپنے سے درگزر فرماتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مولانا ظفراحمد انصاری کے مکان پر ایک دعوت کے موقع پر' جس میں اخوان کے رہنما شیخ صالح عشماوی بھی شریک تھے' جب فوٹو کی نوبت آئی تو مولانا اصلاحی کچھ مضطرب ہوئے۔ جب انصاری صاحب اور میں نے درخواست کی کہ آپ بھی شریک ہو جائیں تو کچھ توقف کے بعد کرسی پر بیٹھ گئے اور آنکھیں نیچی رکھیں۔ غالباً ہمارا دل رکھنے کے لیے!

دل رکھنے پر یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اخوان رہنماؤں کے ساتھ مولانا علی میاں بھی شریک تھے اور سب نے مغرب اور عشا کی نماز جمع کی۔ مولانا علی میاں بھی شریک ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے ادب سے پوچھا کہ مولانا میں تو اتنا پکا حنفی نہیں ہوں اور سفر میں بالعموم جمع بین الصلوتین پر عمل کرتا ہوں لیکن آپ کے شریک ہونے سے ہمت ہو رہی ہے کہ آپ کی رائے معلوم کروں۔ مولانا

مسکرائے اور فرمایا: مسلک تو میرا وہی ہے جو احناف کا معروف مسلک ہے لیکن خیال خاطر احباب میں اور کسی اختلافی صورت سے بچنے کے لیے شریک ہو جاتا ہوں مگر نیت نفل کی کر لیتا ہوں تاکہ لوگ محسوس نہ کریں۔ مولانا علی میاں ہی نے حضرت یحییٰ منیری کے بارے میں لکھا ہے: نفلی روزے سے تھے' ایک مرید حلوہ لایا اور اصرار کیا کہ حضرت' ضرور کچھ تناول فرمائیں۔ تھوڑے توقف کے بعد انھوں نے حلوہ کھا لیا۔ بعد میں جب دوسرے افراد نے پوچھا کہ حضرت' آپ نے روزے میں حلوہ کیسے کھا لیا تو کیا خوبصورت جواب دیا: نفلی روزہ توڑنے کی قضا ہے لیکن ایک چاہنے والے کا دل توڑنے کی قضا نہیں۔ سبحان اللہ! ہمارے بزرگوں نے محبت اور شفقت کی کیسی مثالیں قائم کی ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ مسلمان' مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے!

مولانا اصلاحی صرف ایک بلند پایہ مفکر اور ایک صاحب طرز ادیب ہی نہیں' ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ میں نے ان کی بے شمار تقریریں سنی ہیں لیکن سب سے گہرا نقش ان کی اس مسحور کن تقریر کا رہا جو کراچی کے اجتماع میں انھوں نے درد سر کی حالت میں کی اور جس میں بیان کیا گیا تھا کہ "ہم اس ملک میں کیا تغیرات لانا چاہتے ہیں"۔ مولانا مودودی کی تقریر اگر میدانی علاقے میں بہنے والے دریا کی مانند تھی جس میں روانی کے ساتھ ٹھہراؤ تھا تو مولانا اصلاحی کی تقریر اس پہاڑی نالے کی مانند ہوتی تھی جو پوری رفتار کے ساتھ پتھروں کو اپنے جلو میں بہاتے ہوئے اپنا سفر طے کر رہا ہو اور جس میں روانی کے ساتھ تلاطم اور آبشاروں کا ترنم بھی موجود ہو۔

مولانا اصلاحی کی تقریر ہو یا تحریر' صحت فکر کے ساتھ حسن بیان بھی اس کا ایک مسحور کن خاصہ ہے۔ مجھے ان کی تحریر میں شبلی کی ادبیت' مولانا مودودی کی فکری گہرائی اور سلاست اور ابو الکلام آزاد کی خطابت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ جہاں وہ ٹھوس دلائل اور محکم تحقیق کے بادشاہ تھے وہیں وہ ایک اعلیٰ انشا پرداز اور شگفتہ بیان ادیب اور مقرر تھے۔ ان کے اسلوب میں ایک منفرد شوخی اور بانکپن ہے جس میں قرآن اور بائبل دونوں کے ادب کا پرتو نظر آتا ہے۔

مولانا اصلاحی کی تحریر اور تقریر' بلکہ مجلسی گفتگو میں بھی بلا کی شوخی اور حسب ضرورت طنز کی کاٹ پائی جاتی تھی۔ پاکستانی عورت دوراہے پر (جو اب اسلام میں عورت کے مقام کے نام سے شائع ہوئی ہے) میں حکومت اور کلچر کے کارپردازوں کے بیانات پر ان کی تنقید اس نوعیت کے ادب کا شاہکار ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے "حاکمیت الٰہی یا حاکمیت جمہور" والے مضمون پر اور مولانا منظور نعمانی کے "جماعت اسلامی پر الزامات اور ان کا جواب" اور "نئی فرد جرم" پر تنقید و احتساب صرف علمی مباحث کا مرقع ہی نہیں' ادب و انشا اور طنز کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں۔

بیان کی یہ شوخی مولانا اصلاحی کی طبیعت کا ایک خاص پہلو ہے۔ ان کے اسلوب میں بلا کی بے ساختگی ہے اور اتنے معصوم انداز میں ایسی دلچسپ بات کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا لطف لیتا رہ جاتا ہے۔ جمعیت کے دور کی ایک تربیت گاہ میں کچھ نوجوانوں کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دیکھ کر فرمایا کہ "آپ لوگ ایسے پھل تو نہ بن جائیں جو پکنے سے پہلے ہی سڑ جاتے ہیں"۔ گویا تلقین فرمائی کہ اس دور میں شوخی اور شرارت بھی زندگی کا اسی طرح حصہ ہے، جس طرح سنجیدہ بحث! ایک موقع پر یہ مصرع پڑھا:

ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

میں نے تنہائی میں اس کا دوسرا مصرع پوچھا تو فرمایا: کیا کریں گے آپ جان کر۔ اس وقت یہی مصرع آپ لوگوں کے لیے کافی ہے۔ بعد میں اس کا پہلا مصرع بھی مجھے معلوم ہو گیا اور یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ مولانا نے صرف ایک ہی مصرع کیوں استعمال فرمایا۔

ایک مرتبہ کراچی میں مولانا اصلاحی سے دیر تک ذاتی معاملات پر بات ہوتی رہی۔ میں نے بے تکلفی کے اس ماحول میں ان باتوں کا ذکر کیا جو میں نے اپنے والد سے سنی تھیں۔ ان میں یہ واقعہ بھی تھا کہ جب مولانا اصلاحی کی دوسری شادی ہوئی تو برات کا قیام ہماری ہی خاندانی حویلی میں ہوا تھا جو راہوں، جالندھر میں تھی اور جہاں مولانا مسعود عالم ندوی" کی نگرانی میں دارالعروبہ کام کر رہا تھا۔ اس حویلی کو شیش محل کہتے تھے۔ جناب چودھری عبدالرحمٰن کی حویلی کے بالکل بالمقابل واقع تھی جن کی صاحبزادی سے مولانا اصلاحی کا رشتہ ہوا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ جب میں لاہور آیا اور مولانا سے ملا تو بڑا لطف لے کر فرمایا کہ آپ نے تو مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا۔ میں پریشان ہوا کہ ایسی کیا غلطی ہو گئی ہے۔ فرمانے لگے کہ آپ نے جو باتیں مجھے کراچی میں بتائی تھیں ان کا ذکر اپنے گھر میں کیا۔ پھر تو سوالات کی بارش ہو گئی۔ تم نے یہ کیوں نہ پوچھا اور فلاں اب کس حالت میں ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے مخاطب کر کے فرمایا: آپ کو پتہ ہے میں نے کیا کہا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ 'نیک بخت' میں کوئی عورت نہیں ہوں کہ اتنے سوال کر ڈالتا۔ جب خورشید میاں لاہور آئیں گے تو تم خود پوچھ لینا۔ مزید فرمایا: اب آپ گھر آئیں اور خود بھگتیں! ضمنی طور پر عرض کر دوں کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں ازراہ شفقت مجھے خورشیدؔ میاں کہا کرتے تھے، خورشید صاحب یا پروفیسر صاحب نہیں۔ والدین کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہی دو بزرگ تھے جن کی زبان یا قلم سے "خورشید میاں" سن کر یا پڑھ کر ایک سرور محسوس ہوتا تھا۔ افسوس اب اس طرح پکارنے والا کوئی اور نہ رہا اور اس پر ستم یہ کہ اب تو ہمارا بھی شمار یکے از بزرگاں ہونے لگا!

ایک واقعہ اور سنایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے مولانا اصلاحی کی بڑی بے تکلفی تھی۔ البتہ تصوف اور بیعت وغیرہ کے مسئلہ پر دونوں میں بڑا اختلاف تھا۔ جب ندوی صاحب نے حکیم الامت مولانا اشرف علی

تھانوی سے بیعت کی تو اس کے بعد ملاقات میں خاصی نوک جھونک رہی۔ فرمانے لگے کہ جب سید صاحب نے مجھ سے یہ اصرار کیا کہ تم بھی سنجیدگی سے بیعت کے بارے میں سوچو تو میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ "آپ ہاتھ اٹھائیں اور میں بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں کہ اے میرے رب! جب میری یہ حالت ہو جائے کہ میں اپنی عقل کی باگیں کسی اور کے ہاتھ میں دے دوں تو اس سے پہلے مجھے اٹھا لیجیو"۔ کہنے لگے کہ سلیمان ندوی دم بخود ہو گئے اور پھر کبھی اس مسئلے پر بات نہ ہوئی--- یہ واقعات مولانا اصلاحی کی شخصیت کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں جس کا تعلق بیک وقت عزت نفس' خود اعتمادی اور طبیعت کی شوخی سے ہے۔

اصلاحی صاحب کی زندگی کا ایک اور پہلو ان کی سادگی اور قناعت ہے۔ انھوں نے دنیا کی کبھی طلب نہیں کی۔ جب دنیا دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے گئی تب بھی انھوں نے دنیا کو گھاس نہیں ڈالی۔ نہایت سادہ انداز میں زندگی گزاری۔ ضروریات کو محدود رکھا۔ جو مل گیا اس پر گزارہ کیا۔ رحمان پورہ' لاہور میں جہاں وہ اس زمانے میں مقیم تھے' بارہا ان کے گھر جانے کا موقع ملا اور ہمیشہ ان کی سادہ زندگی پر رشک آیا۔ روایت ہے کہ جب شیخوپورہ میں اپنی اہلیہ کے زرعی فارم (رحمان آباد) منتقل ہو گئے' جہاں تدبر قرآن کی تحریر تسوید کا بیشتر کام ہوا۔ یہاں بجلی کی سہولت بھی نہ تھی لیکن مولانا اصلاحی کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے اور اپنی دھن میں لگے رہے۔

دنیا اسیر ہے مرے دام خیال میں
اے بے خبر مقید دنیا نہیں ہوں میں

سادگی اور قناعت اپنی جگہ لیکن مولانا کی زندگی میں بلا کی شائستگی' نفاست اور سلیقہ تھا۔ لباس' غذا' گفتگو' تحریر' ہر چیز صاف ستھری--- گویا زندگی ایک آرٹ ہے جس میں سادگی تو ہے لیکن سلیقہ اور تزئین کی کمی نہیں۔ روایت ہے کہ مولانا اپنے استعمال کی چیزوں کے بارے میں بھی سخت موحد تھے اور اپنے ہی گھر میں ان کی ایک جداگانہ دنیا تھی جس میں کسی دوسرے کو دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی۔ گویا اس معاملے میں ان کا مزاج کچھ اکبر بادشاہ جیسا تھا' جس نے ہاتھی پر بیٹھنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ اس کا کنٹرول فیل بان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نوجوان بادشاہ نے کہا تھا کہ جس سواری کی لگام میرے ہاتھ میں نہ ہو' میں اس پر سواری نہیں کرتا۔ مولانا بھی اپنی ایک جداگانہ مملکت رکھتے تھے اور اس میں زمام کار ان کے اپنے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ جس طرح وہ عقل کی باگ کسی دوسرے کو سونپنے پر راضی نہ تھے اسی طرح نجی اور شخصی معاملات میں بھی شرکت گوارا نہیں کرتے تھے اور نہ کسی پر بوجھ بننے کو تیار تھے۔

مولانا اصلاحی کی زندگی میں عقل و ارادہ اور خودی اور عزت نفس کے باوجود دل اور دماغ کا بڑا حسین

امتزاج تھا۔ نہ اتنے روکھے کہ بس عقل ہی کے اشارے پر چلتے رہیں اور دل زندہ کے تقاضوں اور مطالبوں کو یکسر نظرانداز کر دیں، نہ اتنے نرم کہ باگ، دل کو تھما دیں اور عقل و خرد کے تقاضوں کو فراموش کر دیں۔ نرمی اور سختی، جرات و بے باکی اور رحمت و التفات، احتساب و سرزنش اور عفو و درگزر کے دھارے ساتھ ساتھ بہتے تھے گویا اس شعر کی نظیر!

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یہی وجہ ہے کہ جہاں دلوں پر مولانا اصلاحی کے علم اور ان کے مقام کا رعب ہے وہیں ان کی مشفقانہ اور پیار بھری شخصیت سے محبت اور ان کی طرف گہری کشش سے ان سے تعلق کی امتیازی نشان عبارت ہے۔ مولانا نے صرف فکر کے چراغ ہی نہیں جلائے انھوں نے شفقت اور محبت کے دیے بھی روشن کیے۔ ان کے افکار اور ان کی تعلیم و تربیت کے اثرات ایک نہیں کئی نسلوں پر ہیں۔ وہ اپنے پیچھے ایک مدت تک زندہ رہنے والی کتابوں ہی کا سرمایہ نہیں چھوڑ گئے بلکہ مختلف سطح پر ایسے شاگرد اور معنوی ذریت بھی چھوڑی ہے جو اس کام کو جاری رکھے گی جس کی صورت گری انھوں نے اپنے خون جگر سے کی۔ اگر ایک طرف اسلامی تحریکات ان کی وارث ہیں تو دوسری طرف انھوں نے ایسے شاگرد بھی چھوڑے ہیں جو پاکستان اور بیرون پاکستان ان کے قائم کردہ کاموں کو ان شاء اللہ جاری رکھیں گے۔ توقع ہے اسی سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

مولانا اصلاحی ہم سے رخصت ہو گئے لیکن مولانا اصلاحی ہمیں وہ کچھ دے گئے کہ ان شاء اللہ جس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی جوانی اور اپنا بڑھاپا تج دیا، وہ مشن زندہ اور تابندہ رہے گا اور اللہ کے بندے اس نور سے مدتوں فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک صدقہ جاریہ ہے جس کا اجر ان شاء اللہ ان تمام بزرگوں کو ملتا رہے گا جنھیں اس صدی میں اسلامی فکر کی تشکیل اور اسلامی احیا کی تحریک کو قائم کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے، ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، ان کے روشن کردہ چراغوں کو ہمیشہ ضوفشاں رکھے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند اور غالب ہو اور امت ہی نہیں، پوری انسانیت کی رہنمائی کا سلسلہ جاری و ساری رہے۔ م

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

اہم گزارش: **ترجمان القرآن** میں اشتہار دینے والے اداروں یا افراد سے معاملات میں کوئی نقصان ہو تو **ترجمان القرآن** کے نمایندے اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ قارئین کو چاہیے کہ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے تحقیقات کریں اور اپنی ذمہ داری پر معاملہ کریں۔

اخبار امت

کوسووو : یورپ کا دوسرا بوسنیا

عبدالغفار عزیز

جس طرح بوسنیا، مسلمانوں کا مقتل بننے سے پہلے ایک غیر معروف نام تھا، اسی طرح کوسووو بھی، ابھی تک ایک غیر معروف نام تھا۔ لیکن حال ہی میں مظاہرین پر پولیس کی فائرنگ سے ۲۷ بے گناہ مسلمانوں کی شہادت نے اسے عالمی خبروں کا موضوع بنا دیا ہے۔

۲۰ لاکھ سے زائد البانوی مسلمانوں کا یہ خطہ سربیا کا حصہ ہے لیکن اپنی شناخت اور حقوق کے لیے برسرِ پیکار ہے۔ اس کے اردگرد بوسنیا، مقدونیہ، البانیہ، جبل اسود، یونان اور بلغاریہ میں تقریباً ایک کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ ۱۹۱۲ سے پہلے یہ سارا علاقہ مملکت البانیہ کا حصہ تھا جس کا رقبہ تقریباً ایک لاکھ مربع کلومیٹر تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۱۳ میں البانیہ کی بندربانٹ کر کے اس کا رقبہ صرف ۲۸ ہزار مربع کلومیٹر باقی رہنے دیا گیا۔ کوسووو کو مزید چھینا جھپٹی سے متعدد بار اپنے علاقوں سے محروم ہونا پڑا۔ ۱۹۴۳ میں اس کا ۲۲ ہزار مربع کلومیٹر علاقہ سربیا اور جبل اسود کو دے دیا گیا۔ اب کوسووو کا کل رقبہ تقریباً ۱۱ ہزار مربع کلومیٹر بچا ہے۔

کوسووو قدیم زمانے سے ایک خود مختار ریاست رہا ہے۔ خلافت عثمانیہ نے بھی اسے اپنی قلمرو میں شامل کرتے ہوئے اس کی شناخت اور خود مختاری بحال رکھی۔ سابق یوگوسلاویہ کے دستور میں بھی کوسووو (یا کوسووا) کو یوگوسلاویہ کی ایک خود مختار ریاست تسلیم کیا گیا اور دوسری ریاستوں کی طرح اسے بھی یہ قانونی حق دیا گیا کہ وہ جب چاہے اپنا حق خود ارادیت استعمال کر سکتی ہے۔ لیکن جتنی قدیم تاریخ کوسووو کی خود مختاری کی ہے اتنی ہی طویل تاریخ کوسووو پر قبضہ جمانے کی سرب خواہش کی ہے۔ تیرھویں صدی میں سٹیفن میلوٹن نے "مملکت سربیا" تشکیل دیتے ہوئے کوسووو اور دیگر مسلم علاقوں پر بھی اپنا تسلط قائم کیا تھا اور حالیہ سرب قوم پرست مسیحی اسی تسلط کو اپنے لیے جواز بناتے ہوئے کوسووو پر اپنا حق جتاتے ہیں۔

سربیا نے مسلح کارروائیوں کے ساتھ ساتھ، فلسطین میں یہودی آباد کاری کی طرز پر کوسووو میں سربوں کی آباد کاری کے لیے اقدامات کیے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ۱۹۹۲ میں، کوسووو میں رہائش کے لیے آمادہ سربوں کے لیے مفت مکان اور آسان قرضوں کے لیے، ایک کروڑ ۳۷ لاکھ جرمن مارک کا بجٹ رکھا۔ گذشتہ پانچ برس کے دوران کوسووو میں سرب آباد کاروں کی سہولت کے لیے ایک قانون کے مطابق کسی بھی

البانوی باشندے (یعنی مسلمان) کے ہاتھ جایداد فروخت کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی جبکہ اگر کوئی مسلمان اپنی جایداد فروخت کرنا چاہے تو اسے وظائف اور دوسرے لالچ دیے گئے۔ سربیا کا ماٹو تھا کہ کوسووو میں آباد کاری ایک مقدس قومی فریضہ ہے۔

کوسووو سے مسلمانوں کو زبردستی بے دخل کرنے کا طویل المیعاد منصوبہ بھی ایک مدت سے جاری ہے۔ اس وقت وہ البانوی النسل مسلمان جو اپنی دھرتی ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ' جرمنی اور آسٹریا میں رہایش پذیر ہو چکے ہیں' ان کی تعداد چار لاکھ سے زائد ہے۔ ۱۹۹۵ میں ۸۵۴ مسلم خاندانوں کو ان کے گھروں سے زبردستی بے دخل کر کے وہاں کراجینا سے آنے والے سربوں کو بسا دیا گیا۔

اس کے علاوہ کوسووو کے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر مفلوج کرنے کا کام تیزی سے اور مسلسل جاری ہے۔ اب تک ڈیڑھ لاکھ سے زائد افراد کو ان کی ملازمتوں سے نکالا جا چکا ہے۔ ریاست کوسووو کی فیکٹریوں اور کارخانوں کو پرائیویٹائزیشن کے ذریعے چھینا اور سربوں کے ہاتھ میں دیا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کو ختم کرنے کے لیے البانوی زبان میں ریڈیو' ٹی وی کی نشریات بند کر دی گئی ہیں۔ البانوی زبان کے اخبارات بند کر دیے گئے ہیں۔ کوسووو کے تعلیمی اداروں پر سرب انتظامیہ مسلط کر دی گئی ہے۔ حال ہی میں کوسووو کی پرشتینا یونی ورسٹی میں البانوی زبان میں تعلیم دینے پر پابندی لگا دی گئی جس پر ایک طویل احتجاجی تحریک چلی۔

سربیا کے ان سب اقدامات پر مستزاد اس کا وہ اقدام ہے جس کے ذریعے اس نے کوسووو کی خود مختاری کا حق سلب کر لیا۔ اپنی طویل تاریخ میں ریاست کوسووو کی حیثیت ہمیشہ خود مختاری کی رہی لیکن ۱۹۸۹ میں سربیا نے اپنی افواج کے ذریعے اقدام کرتے ہوئے کوسووو کی خود مختاری ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اقدام نے آزاد مسلم عوام میں آزادی کی لہر پیدا کر دی اور انھوں نے اپنی صفوں کو منظم کرتے ہوئے ۱۱ ستمبر ۱۹۹۱ کو کوسووو کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۲۶ سے ۲۹ ستمبر ۹۱ کے ایک بھرپور عوامی ریفرنڈم میں اس اعلان آزادی کی توثیق کی گئی اور مئی ۱۹۹۲ میں عام انتخابات منعقد کرتے ہوئے کوسووو اسمبلی منتخب کر لی گئی۔ ابراہیم روجووا اس کے صدر منتخب ہوئے لیکن سربوں نے انھیں پارلیمنٹ کا اجلاس بلانے یا حکومت تشکیل دینے کی اجازت نہیں دی بلکہ سرب تسلط برقرار رکھا جس پر انھوں نے جلاوطن حکومت تشکیل دینے کا اعلان کر دیا۔ اسے صرف ریاست البانیہ نے تسلیم کیا۔

ان حقائق کی روشنی میں کوسووو کے حالیہ المیے کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ سرب درندگی و سفاکی کے ساتھ آبادیوں کو تہ تیغ کرتے ہوئے کوسووو کو "عظیم سرب مملکت" کا جزو لاینفک بنانا چاہتے ہیں جیسا کہ سرب صدر سلوبوڈان میلاوچ نے بیان دیتے ہوئے کہا "اصل مسئلہ کوسووو کے مستقبل کا نہیں ہے کیونکہ کوسووو سربیا کی سرزمین اور اس کا حصہ ہے اور رہے گا۔ اصل مسئلہ' چند دہشت گردوں کا ہے جن کا علاج ضروری ہے"۔

دوسری طرف ۲۰ لاکھ مسلمان ہیں جو اپنی مسلم اور البانوی شناخت اور اپنی آزادی بحال کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۹۱ کے پرامن اعلان آزادی' عوامی ریفرنڈم اور عام انتخابات کے نتیجے میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے ان میں مسلح جہاد کا جذبہ بیدار ہو رہا ہے اور کوسووو پارلیمنٹ کے سربراہ ابراہیم روجووا کی دھیمے مزاج کی پالیسی کے مقابلے میں قدرے تند پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ایک کوسووو لبریشن آرمی میدان عمل میں ہے جو کوئی نہ کوئی جوابی کارروائی کرتی رہتی ہے۔

تیسری طرف امریکی' یورپی (خاص طور پر فرانس' جرمنی اور یونان) روسی اور چینی قیادت ہے جو کوسووو' البانیہ اور مقدونیہ کے مسلمانوں کو متحد اور مضبوط نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لیے وہ کھلے' چھپے سربیا کی مدد بھی کر رہے ہیں اور اس کے اس موقف کی تائید کر رہے ہیں کہ کوسووو کو "متحدہ سربیا" کا حصہ رہنا چاہیے۔ اسے آزاد ریاست کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ وہ کوسووو لبریشن آرمی پر دہشت گردی کا لیبل لگاتے ہوئے اسے کچلنے کی ترغیب دے رہے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف بیان بھی دے دیتے ہیں۔

اس تناظر میں یہ دکھائی دے رہا ہے کہ اگر کوسووو کے مسلمانوں کو کوئی قابل ذکر اخلاقی و سیاسی مدد نہ ملی تو سربیا قتل و غارت کرتے ہوئے آزادی کی اس لہر کو بالکل خاموش کر دینے کی کوشش کرے گا یا اپنے عالمی سرپرستوں کے تعاون سے کوسووو کے برائے نام سیاسی حل کے نام پر اپنے تسلط کو عملاً مضبوط تر بنا لے گا۔ لیکن ان دونوں مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کوسووو کے مسلمانوں کی وہ بیداری ہے جس کا ثبوت کوسووو کے جلاوطن وزیراعظم کے اس انٹرویو سے مل رہا ہے جو انھوں نے گذشتہ دنوں بوسنیا کے شہر توزلا کے دورے کے دوران دیا۔ پچاس سالہ سرجن ڈاکٹر بویاربو کوشی نے بتایا کہ کوسووو کے عوام بیدار اور ہر طرح کی مزاحمت کے لیے تیار ہیں۔ ہماری سیاسی قیادت نے سیاسی حل کی کوشش کی ہے لیکن یہ وقت میلاوچ اور اس کے ساتھیوں کو مزید تیاری اور مزید ظلم کا موقع دیتا ہے۔ ہم کوئی فوج یا پولیس نہیں رکھ سکتے بلکہ اپنے دفاع کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ ہم پر دہشت گردی کا الزام بالکل ناروا ہے۔ ستر سال کا بوڑھا اپنے گھربار کا دفاع کرے تو کیا اسے دہشت گرد کہا جا سکتا ہے؟ پولیس کی فائرنگ سے شہید ہونے والوں میں بچے اور خواتین بھی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر سربیا کو نہ روکا گیا تو پورے علاقے کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔

ان حالات میں' اصل فریضہ عالم اسلام کا ہے کہ بیدار ہو اور اپنی قوت اپنے بھائیوں کے حق میں استعمال کرے۔ مسئلہ سربوں کا داخلی نہیں ہے' نہ البانوی سرب نسلی مسئلہ ہے' بلکہ مسئلہ وہی ہے کہ مہذب یورپ کے کرتا دھرتا' قلب یورپ میں مسلمانوں کو پنپنے نہیں دینا چاہتے اور وہ کوسووو میں بوسنیا کے طرز پر

ایک دفعہ پھر نسلی صفائی میں تکلف نہیں کر رہے ہیں۔ گھر جلائے جا رہے ہیں' لاشوں کا مثلہ ہو رہا ہے اور خواتین کی عزتیں محفوظ نہیں ہیں لیکن عالمی ٹھیکے دار سربوں کا ہاتھ پکڑنے کے لیے تیار نہیں۔

انڈونیشیا : بحران کی زد میں

مسلم سجاد

کمرہ امتحان کے نگران کے انداز سے کھڑے ہوئے آئی ایم ایف کے ایم ڈی مائیکل کیم ڈ ےسس اور امتحان دینے والے طالب علم کی طرح' انڈونیشیا کے صدر سہارتو کی دستخط کرنے کی تصویر' کل کے ایشیائی ٹائیگر کے آج کی بلی بننے کی آئینہ دار ہے۔ ایشیائی معجزے' ایشیائی اقدار' ۲۱ ویں صدی ایشیا کی صدی کے خواب' خواب ہوئے۔ عالمی گاؤں کی معیشت جن ہاتھوں میں ہے' انھوں نے کچھ جھٹکے دے کر سب کے کس بل نکال دیے اور اب اسی سے دوا لی جا رہی ہے جس نے مرض دیا ہے۔ ملائشیا نے کچھ مقابلہ کر لیا' اب انڈونیشیا عالمی خبروں کا موضوع ہے۔ سہارتو نے' جو ۱۹۶۵ء کی خوں ریزی کے بعد سے' جس میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے' اس سب سے بڑے اسلامی ملک کی قسمت کے مالک ہیں' مسلسل ساتویں بار صدر منتخب کروانے کے بعد' قرآن کے سائے میں' ۱۱ مارچ کو پھر حلف اٹھایا ہے۔

فوجی طاقت کے بل پر' چوکیداری چھوڑ کر' گھر کے مالک بن جانے والے ان حاکموں کا فلسفہ یہ ہوتا ہے کہ معاشی ترقی اور استحکام کے لیے جمہوری آزادیوں کو قربان کرنا ضروری ہے۔ وہ مغرب کے اباحیت پسند کلچر کو تو اپنے مسلم معاشروں میں فروغ دینے کے لیے ہر طرح کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' لیکن مغرب کی پریس کی آزادی' آزادانہ انتخابات' عوامی نمایندوں کا احتساب انھیں اپنے ملک میں بالکل گوارا نہیں ہوتا۔ وہ جمہوریت کا ایسا قالب لے کر آتے ہیں جس میں ان کا تخت ہمیشہ سلامت رہے۔ اس کو وہ استحکام کہتے ہیں۔ بالعموم مسلم ممالک کے بدقسمت عوام کے حصے میں معاشی ترقی بھی نہیں آتی۔ وہ بنیادی حقوق اور آزادیوں سے محروم' ظلم و استبداد کا شکار رہتے ہیں لیکن انڈونیشیا اس لحاظ سے ایک مثال قرار دیا جاتا تھا کہ یہاں ۷ فی صد کی شرح سے مسلسل ترقی ہوئی ہے۔ خوش حالی نظر آتی ہے' کشادہ سڑکیں (ہم تو ایک موٹر وے پر ہی صدقے جا رہے ہیں!) بلند و بالا عمارات' اپنی کاریں' ہوائی جہاز' مغربی کلچر بھی' تھوڑا بہت اسلام بھی——— اور مسلمان کیا چاہتے ہیں!

لیکن اس ترقی کے ساتھ' صدر سہارتو کے بیٹوں' بیٹیوں' دامادوں اور دوستوں کی کرپشن کی ایسی ہوش ربا داستانیں ہیں کہ ہمارے زرداری اور عثمان فاروقی ان کے آگے ہیچ ہیں۔ سب کچھ کھلے عام ہے۔ نہ شرم' نہ پردہ۔ مغرب سہارتو کو ہٹانا چاہتا ہے تو مغربی پریس میں کرپشن کی داستانیں' تفصیل سے اور چارٹ بنا کر

شائع کی جا رہی ہیں کہ کس بیٹی یا بیٹے کے پاس کیا ہے۔ جب تک مفید مطلب ہوتا ہے' آنکھیں بند رکھی جاتی ہیں' بلکہ سر پر ہاتھ رکھا جاتا ہے' لیکن جب آنکھیں پھیر لی جائیں تو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے اور خود ملک کے بے خبر عوام کو بھی اپنے حاکموں کی کرتوتیں سی این این' بی بی سی اور ٹائم' نیوز ویک اور ایشیا ویک سے ملنے لگتی ہیں۔ اکانومسٹ جیسے رسالے کی سرورق کہانی Stand Down, Suhart ہوتی ہے (۲۳ جنوری ۹۸)۔

گذشتہ مئی کے انتخابات کے موقع پر جب سوئیکارنو کی بیٹی کو لیڈر بنایا جانے لگا اور اس کی علامت کے طور پر اس کی تصویر ٹائم اور نیوز ویک نے سرورق پر شائع کی (جس کی تمنا ہی ہمارے بھٹو صاحب کرتے رہے) تو اندازہ ہوتا تھا کہ اب سہارتو کے جانشین کی تلاش ہے۔ سہارتو نے اپنے داؤ پیچ کے ذریعے پارٹی کو اس کی لیڈر سے محروم کر دیا۔ چنانچہ انتخابات میں اس کی پارٹی کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ سب سے بڑی تو سرکاری گولکار پارٹی کو رہنا ہی تھا' کچھ زیادہ ووٹ اسلام پسند پارٹیوں کے حصے میں آ گئے اور انڈونیشیا نسبتاً کم سیکولر نظر آنے لگا۔ لیکن اس کے بعد سے انڈونیشیا کو غیر مستحکم کرنے کے منصوبے پر عمل شروع ہو گیا۔ رمضان میں مہنگائی اتنی بڑھ گئی کہ عوام افطار اور سحری کو بھی ترس گئے۔ دکان داروں کی دس سال کی بچت ۶ ماہ کے افراط زر نے ہڑپ کر لی۔ اسٹاک ایکسچینج میں ۲۳۸ میں سے ۲۰۰ کمپنیاں دیوالیہ ہو گئیں۔ ڈالر ۲۰۰۰ انڈونیشی روپے سے بڑھ کر ۵ ہزار اور اب ۲۴ ہزار تک پہنچ گیا۔ چنانچہ احتجاج ہو رہے ہیں' مظاہرے ہو رہے ہیں لیکن حاکم یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں کہ ملک کے عوام ان سے نجات چاہتے ہیں۔ اب مزید سواری دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

برطانیہ کے لمپیکٹ انٹرنیشنل (مارچ ۹۸) نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں سرکاری ریکارڈ سے' ہزاروں سفارتی مراسلوں اور فائلوں سے' انڈونیشیا میں گذشتہ ۳۰ سال میں امریکی مداخلت کی تفصیل مستند طور پر پیش کی گئی ہے۔ اس آئینے میں آج کی تصویر (صرف انڈونیشیا ہی کی نہیں) دیکھی جا سکتی ہے۔ پہلے کارروائیاں خفیہ کی جاتی تھیں' اب کھلے عام ہوتی ہیں۔

گذشتہ دو ماہ میں امریکی وزیر خانہ اور وزیر دفاع' آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے سربراہ جکارتہ آ کر مشورے دے چکے ہیں۔ صدر کلنٹن نے ایک ہفتے میں دو بار فون کیا تاکہ سہارتو آئی ایم ایف کی ۵۰ شرائط پر دستخط کر کے ۴۳ ارب ڈالر کا قرض حاصل کرے۔ اب کلنٹن کی جانب سے کارٹر کے دور کے نائب صدر والٹر مانڈیل خصوصی طور پر جکارتہ جا رہے ہیں تاکہ سہارتو سے وہ باتیں بھی صاف صاف ہو جائیں جو صدر کلنٹن فون پر نہ کر سکے۔ کلنٹن نے برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر' فرانس کے صدر شیراک اور جرمن کے چانسلر کوہل سے گفتگو کر کے انڈونیشیا پر بین الاقوامی اتفاق رائے حاصل کیا ہے تاکہ یہ ممالک سہارتو پر دباؤ

ڈالیں کہ وہ امریکی مشورے کو تسلیم کرے۔ مانڈیل کے ساتھ سفر کرنے والے ایک افسر نے بتایا کہ سہارتو سے کہا جائے گا کہ وہ اپنی کابینہ میں ایسے افراد کو لیں جو آئی ایم ایف کے ساتھ چل سکیں۔ بی جے حبیبی (جو نائب صدر مقرر ہوئے ہیں) جیسے نہیں اور نہ ان کے جیسے اسلامی ذہن کے کوئی دوسرے فرد۔

آزادی کے بعد سے انڈونیشیا میں سوچی سمجھی کوشش کی گئی کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی اسلامی اثرات سے آزاد ہو اور سیکولر اقدار رائج کی جائیں۔ ۱۹۶۵ کے خونی انقلاب کے بعد جو نظام انڈونیشیا کے لیے وضع کیا گیا' اس میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ عامۃ الناس کے دینی رجحانات یا اسلامی غلبے کے لیے جدوجہد کرنے والے' کوئی مقام نہ حاصل کر سکیں۔ انڈونیشیا کی تاریخ میں مسلمانوں کے لیے شدید ترین استبداد کا دور شروع ہوا۔ لیکن یہ ان کے لیے کوئی پریشانی کا باعث نہ ہوا' جو آج کرپشن اور جمہوری اقدار کے لیے فکرمندی ظاہر کر رہے ہیں۔ دراصل پورا منصوبہ یہ تھا کہ بہت بڑے پیمانے پر عیسائی تبلیغی کوششوں سے انڈونیشیا کو عیسائیت کے لیے فتح کر لیا جائے۔ ۶۰ کے عشرے کے اواخر سے ۸۰ کے عشرے کے اواخر تک' ۲۰ سال انڈونیشیا میں بے انتہا وسائل کی پشت پناہی سے عیسائیت کی تبلیغ کی نہایت جارحانہ مہم چلائی گئی۔ عائلی قانون میں ایسی ترمیم کی گئی کہ عیسائی مرد' مسلمان لڑکی سے شادی کر سکے۔ عیسائی فوجی جنرل' عیسائی وزرا' عیسائی بیوروکریٹ اور عیسائی اہل فکر اور ساتھ ہی سرکاری اور میڈیا کی پالیسیوں نے مسلم معاشرے کی اقدار کو مسخ کر کے سیکولر اقدار کو رائج کیا۔ ان کوششوں سے یہ مقصد تو حاصل نہ ہوا کہ مسلمان عیسائی ہو جاتے لیکن پرامن معاشرے میں مذہبی افتراق و انتشار ضرور پیدا ہوا۔ ۹۰ کے عشرے میں اسلامی احیا کے آثار نظر آنے لگے۔ یہ مسلمانوں کی روایتی مزاحمت کا اظہار ہے۔ ہر طرح کی کوششوں کے باوجود لوگ اسلام سے دور نہیں ہوئے بلکہ قریب ہی آئے ہیں۔ یہ تبدیلی سہارتو کی وجہ سے نہیں آئی۔ معاشرے میں تبدیلی آئی اور سہارتو بھی اس کا حصہ ہے۔

اس وقت سب بندوقوں کا رخ سہارتو کی طرف ہے۔ جم ہاگ لینڈ نے ۲۳ فروری ۹۸ کے واشنگٹن پوسٹ میں انکشاف کیا ہے کہ کلنٹن کے چیف آف سٹاف ارسکائن باؤلز کے دفتر میں ایک اعلیٰ سطح کا ورکنگ گروپ تقریباً روزانہ ان مسائل پر میٹنگ منعقد کرتا ہے۔

سہارتو سے کلنٹن اس لیے بھی ناراض ہے کہ اس نے کہا کہ اسرائیل کو تسلیم کر لو تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ اس کے دو قصور اور بھی ہیں۔ پہلا یہ کہ اس نے انڈونیشیا کی نوے فی صد مسلم اکثریت کو سیاسی نظام میں کچھ مقام دے کر انھیں شرکت کا احساس دلایا ہے۔ دوسرے' بوسنیا' سوڈان' عراق اور فلسطین کے بارے میں آزاد پالیسی اختیار کی۔ تیسرا' ڈاکٹر بی جے حبیبی کو آگے بڑھاتا ہے جس کے بارے میں اکانومسٹ نے لکھا کہ غیر ملکی سرمایہ کار اسے پسند نہیں کرتے۔ غیر ملکی اخبار' حبیبی کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ اگر ضرورت پیش آ جائے تو یہ صدارت کا عہدہ سنبھالیں گے۔ یقیناً مغربی طاقتیں یہ پسند نہیں کرتیں کہ بیس کروڑ عوام لمحہ دنیا کے نہایت قیمتی قدرتی ذخائر' اس جیسے شخص کے ہاتھ میں آئیں۔

انڈونیشیا پر دباؤ ڈالنے کی یہ کوششیں معکوس نتائج پیدا کر رہی ہیں۔ گولکار (سرکاری پارٹی) کے ایک ممبر پارلیمنٹ لقمان ہارون نے کہا کہ ہم ماڈیل کے مشورے سننے کو تیار ہیں لیکن وہ ہمیں یہ نہ بتائیں کہ ہم کسے اپنا صدر، یا نائب صدر بنائیں۔ امریکہ سے ہماری دوستی ہے مگر یہ صحیح بات نہیں کہ واشنگٹن ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے۔ انڈونیشیا کے ایک امریکہ نواز کیتھولک اخبار نے بھی لکھا کہ ملک میں آئی ایم ایف اور اس کے مغربی حلیفوں کے خلاف جذبات ابھر رہے ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ خراب معاشی صورت حال جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہے تاکہ انڈونیشیا پر اپنی مرضی مسلط کی جا سکے۔

منظرنامہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے: خراب معیشت کی وجہ سے بے چینی، احتجاج، مظاہرے ---- حکومت کے خلاف کامیاب نہ ہوں تو ان کا رخ چینی اقلیت کی طرف موڑ دیا جائے۔ اس سے چینی مہاجرین کا مسئلہ (جیسے ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان میں ہندو) پیدا ہو جائے۔ ایسی صورت حال ہو جائے کہ چین، چینی اقلیت کے تحفظ کے لیے اپنی بحریہ بھیج دے، جس سے مشرقی ایشیا میں عدم استحکام ہو اور پیسفک (pacific fleet) فلیٹ داخل ہو سکے۔

مسلم ممالک کے یہ حالات جس کی ایک مثال انڈونیشیا ہے، امت مسلمہ کے لیے آنکھیں کھول دینے والے ہیں۔ عراق کے ساتھ اقوام متحدہ کے پردے میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ڈھکا چھپا نہیں اور اب انڈونیشیا کو غیر مستحکم کیا جا رہا ہے۔ مغربی ممالک کسی مسلمان ملک کو، خواہ وہاں ان کے گماشتے ہی حکومت کرتے ہوں مستحکم اور ترقی یافتہ نہیں دیکھ سکتے۔ امت مسلمہ میں عام بیداری اور جرات مند مسلمان قیادت کے ہاتھوں میں اختیارات و وسائل کا آنا، ان مسائل کا حقیقی حل ہے۔

دعوتی کام کرنے والے کارکنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

شعورِ حیات

مولانا محمد یوسف اصلاحی

مؤثر اندازِ تحریر ---- تربیت اور تزکیے کے لیے انتہائی مفید

● نئے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ● کمپیوٹرائزڈ کتابت

جلد اوّل: ۔/39 روپے جلد دوم: ۔/39 روپے

البدر پبلی کیشنز، 23 - راحت مارکیٹ، اردو بازار لاہور 54000

منشورات کی تازہ ترین پیش کش

رسول اللہؐ کی وصیتیں

ہمارے رسولؐ نے ہمارے لیے جو وصیتیں کیں

ابو مسعود اظہر ندوی نے ہمارے لیے جمع کر دی ہیں۔

پاکستان میں پہلی بار

صفحات ۱۴ قیمت ۲۵ روپے

دست شفا اور نسخہ شفا

مسلمان معالجوں کو اپنے مریضوں کے روحانی امراض کی شفا کے لیے بھی فکر مند ہونا

روح کی شفا سے جسم کی شفا وابستہ ہے۔

خرم مراد

کا یہ خطاب ہر ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھ کے لیے ہے۔

۲۰ صفحات دیدہ زیب سرورق

قسم اعلیٰ ۷ روپے فی عدد۔ عام تقسیم کے لیے ۳۰۰ روپے سیکڑہ

منشورات، منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 54570

ڈیلینٹ بک پوائنٹ، اے ۵۷، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی فون: 4967661

بک ٹریڈرز، نصر چیمبرز، بلاک ۱۹، مرکز ایف ۷، اسلام آباد فون: 823094

بوسنیا میں کاروانِ رحم

ابو معاذ

"اگر کسی کو دورِ حاضر میں کوئی معجزہ دیکھنا ہو تو وہ بوسنیا آ کر دیکھے" یہ الفاظ اسد خان، ڈائریکٹر کاروان رحم (convoy of mercy) نے ایک موقع پر کہے تھے۔ یہ تنظیم برطانیہ میں مقیم کچھ مسلمانوں نے بوسنیا میں کام کرنے کے لیے اگست ۱۹۹۲ میں قائم کی تھی۔

میں روزگار کی تلاش میں بوسنیا پہنچا۔ ایک روز سرراہ میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی جو برطانیہ میں مقیم تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بوسنیا کے مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات عام کرنے اور ان کی امداد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر اس کام میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہو تو تمھارے روزگار کا بھی کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ میں نے اس کے ساتھ کام کرنے کی حامی بھرلی۔ یہ شخص ۴۵ سالہ اسد خان تھا جو کراچی کا رہنے والا ہے، مگر گذشتہ ۳۰ سال سے انگلینڈ میں مقیم ہے اور منظم انداز میں نہایت سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہا ہے۔

معاملات طے ہونے پر اس نے بوسنیا میں اپنی تنظیم کا ۱۵ کمروں پر مشتمل جدید سہولتوں سے آراستہ ایک بڑا آفس، چار گاڑیاں، ۱۰ کمپیوٹر سیٹ، فیکس مشین سب میرے حوالے کر دیں، اور مجھے ڈائریکٹر نامزد کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً دو لاکھ پاکستانی روپے کی رقم میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ روزانہ گاؤں گاؤں جا کر دعوت افطار کا اہتمام کرو۔

اسد خان میرا محسن ہی نہیں، ایک درد دل رکھنے والا مجاہد صفت مسلمان بھی ہے۔ اگست ۱۹۹۲ سے اب تک ۷۵ مرتبہ انگلینڈ سے بوسنیا تک خود ٹرک چلا کر امدادی سامان لا چکا ہے۔ اسی طرح کے ایک سفر کے دوران کروشیا میں محض مسلمان ہونے اور مسلمانوں کی امداد کے جرم میں گرفتار ہوا اور سخت سردی میں بغیر بستر کے ۱۳ دن کروشیا کی جیل میں گزارنے پڑے۔ وہاں یہ بات اس کے علم میں آئی کہ کروشیا کی جیلوں میں ۲۰ سے زائد ترک مسلم نوجوان گرفتار تھے جو زمانہ جنگ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد کے لیے ترکی سے بوسنیا آ رہے تھے۔ امن کی دعوے دار حکومت کروشیا نے بغیر کسی جرم کے انھیں گرفتار کر رکھا تھا۔ ان کے والدین تک کو علم نہ تھا کہ ان کے جگر گوشے کہاں اور کس حال میں ہیں؟ اسد خان نے جیل سے چھوٹتے ہی ان کی رہائی کے لیے مہم چلائی، یوں ان بے گناہ نوجوانوں کو رہائی نصیب ہوئی۔

اب تک اسد خان کھانے پینے کا سامان تقریباً دو ہزار ۵ سو ٹن، ادویات ۴۵ ٹن اور دیگر سامان تقریباً ساڑھے تیرہ ٹن لا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۵ ہزار نئے کمبل بھی لائے گئے جبکہ جوتوں اور کپڑوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا، شاید لاکھوں کی تعداد میں۔ یہ سب پورے بوسنیا میں تقسیم کیے گئے۔

یہ تو اسد خان کے ذاتی کردار کے حوالے سے چند باتیں تھیں۔ کاروان رحم، بوسنیا کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ تنظیم کی طرف سے حکومت بوسنیا کو چھ ایمبولینس، تین بڑے ٹرک اور لینڈ روور تحفتاً پیش کیے گئے۔ انگریزی زبان سکھانے کے لیے اور کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے متعدد مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ مجاہدین اور مہاجرین کے علاج کے لیے میڈیکل سنٹر قائم کیے گئے ہیں۔ زیادہ زخمی افراد جن کا مقامی طور پر علاج ممکن نہیں، ان کو بیرون ملک علاج کے لیے بھجوانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اب تک پچیس سے زائد افراد کو علاج کی غرض سے انگلینڈ، ترکی، جرمنی اور پاکستان بھیجا جا چکا ہے۔

زمانہ جنگ میں، جب تک بوسنیا اور کروشیا کی جنگ نہیں ہوئی تھی، بوسنیا کے باشندے ہجرت کر کے کروشیا جاتے تو کروشیا کی حکومت عیسائی مہاجرین کی زیادہ سے زیادہ مدد کرتی۔ انھیں کیمپوں میں رکھتے جبکہ مسلمان مہاجر کھلے آسمان تلے سخت سردی کے موسم میں بے یار و مددگار پڑے ٹھٹھرتے رہے۔ ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ اسد خان نے وہاں کا دورہ کیا اور مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھنے کے بعد عملی اقدام اٹھاتے ہوئے مہاجرین کو کیمپوں سے نکال کر کرائے کے گھر لے کر انھیں وہاں منتقل کیا۔ دو عمارتوں کو مرمت کے بعد رہایش کے قابل بنایا گیا۔ اس پر تقریباً ۲۵ لاکھ پاکستانی روپے خرچ ہوئے۔

اسی طرح بوسنیا میں مساجد کی تعمیر کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ سکول کھولے جا رہے ہیں۔ سکولوں کے لیے سٹیشنری، کتب اور دیگر چیزیں وسیع پیمانے پر فراہم کی جا چکی ہیں۔

شہدا کے اہل خاندان کی دیکھ بھال باقاعدہ کی جاتی ہے۔ ان کے لیے مناسب روزگار کی فراہمی کا اہتمام بھی کیا جا رہا ہے۔ مقامی تنظیمیں قائم کی گئی ہیں جو اس کام کی نگرانی کرتی ہیں۔ دیگر امور کے ساتھ ساتھ بوسنوی زبان میں اسلامی کتب وسیع پیمانے پر پھیلائی جا رہی ہیں۔

گذشتہ رمضان المبارک میں تنظیم نے افطار دعوتوں کے ذریعے بڑی تعداد میں لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی۔ گاؤں گاؤں جا کر افطاریوں کا اہتمام کیا اور لوگوں کو عید کے تحفے بھی دیے۔ اس کام میں تقریباً دس ہزار ڈچ مارک خرچ ہوئے۔ بوسنوی اور انگلش دونوں زبانوں میں درس قرآن کا اہتمام کیا گیا۔

بوسنیا میں اب ایک نئے محاذ پر جنگ لڑی جا رہی ہے۔ یہ بوسنیا کی جنگ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ جنگ این جی او (NGO) کے ذریعے نظریاتی محاذ پر لڑی جا رہی ہے۔ اس وقت بوسنیا میں ۱۰۰ سے ۱۵۰ تک غیر مسلم این جی اوز کام کر رہی ہیں اور وسائل پانی کی طرح بہا رہی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے بوسنیا کے اسلامائزیشن کے عمل کو روک لیا جائے یا مزید آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ اس کے مقابلے میں صرف ۳۵ مسلم این جی اوز اس محاذ پر سرگرم عمل ہیں۔

رسائل ومسائل

مقروض کا صدقہ کرنا

ایک صاحب کو قرض ادا کرنا ہے لیکن وہ قرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صدقہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ کیا انھیں پہلے قرض ادا کرنا چاہیے یا ساتھ ساتھ صدقہ بھی کر سکتے ہیں۔

حقوق العباد کی بروقت ادایگی بہت زیادہ ضروری ہے۔ جن لوگوں کے قرض کسی کے ذمہ ہوں‘ ضروری ہے کہ وہ وعدے کے مطابق ادا کیے جائیں۔ اگر کوئی قرض ایسا ہے کہ اس کی ادایگی کا وقت آپہنچا ہے اور صدقہ کرنے سے وہ حق متاثر ہوتا ہے تو ایسی صورت میں صدقہ کو موخر کرنا چاہیے۔ لیکن اگر قرض کی میعاد ابھی دور ہے اور غالب گمان ہو کہ صدقہ کرنے سے قرض کی ادایگی متاثر نہ ہوگی بلکہ قرض کی ادایگی اپنے وقت پر ہو جائے گی تو ایسی صورت میں صدقہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اتنی مقدار میں کہ گھر کے جاری اخراجات میں بھی خلل نہ آئے‘ ان کے لیے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا پڑے اور قرض بھی اپنے وقت پر ادا ہو جائے۔ قرآن پاک میں اس کے لیے یہ اصول بیان کیا گیا ہے: ”وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اپنے ہاتھ کو گردن سے ملا کر جکڑ نہ دو اور اسے پوری طرح کھلا بھی نہ چھوڑ دو کہ اس کے بعد ملامت زدہ اور حسرت زدہ ہو کر بیٹھ جائے۔ اس لیے جس طرح قرض کی وجہ سے آدمی اپنا کھانا پینا اور دیگر اخراجات محدود کرتا ہے تاکہ قرض کی ادایگی کے لیے رقم بچائی جاسکے‘ اسی طرح صدقہ وخیرات کو بھی محدود کرنا چاہیے۔ اس کو بھی اس حد تک رکھنا چاہیے کہ قرضوں کی ادایگی متاثر نہ ہو۔ (مولانا عبد المالک)

بیٹی یا بیٹے کا مسئلہ

میری شادی ایک پڑھے لکھے‘ بظاہر دینی مزاج رکھنے والے شخص سے ہوئی ہے۔ آج کل میں امید سے ہوں۔ شوہر مجھے اس میں tension دیتے رہتے ہیں‘ ان کو بیٹے کا بہت کمپلیکس ہے۔ شاید اس لیے کہ ان کے دیگر بھائیوں کے یہاں بھی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ وہ بیٹیوں کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ان کو یہ خیال ہے کہ ان کے یہاں بھی شاید بیٹی ہی ہو جائے اس لیے وہ مجھے سب کے سامنے نظرانداز کرتے ہیں‘ میری بالکل پروا نہیں کرتے۔ بس ہر وقت یہی کہتے رہتے ہیں کہ بیٹا ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنی باتوں سے مجھے یہ تاثر دیا ہے

کہ اگر بیٹی ہوئی تو وہ مجھے اور اپنی بیٹی دونوں کو پھینک دیں گے۔ پلیز آپ مجھے بتایئے کیا ایک پڑھے لکھے اور اسلام سے قریب شخص کو یہ باتیں زیب دیتی ہیں۔

اولاد کے حوالے سے بہت سے پاکستانی گھرانوں میں یہ صورت حال ہے کہ اگر کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہو جائے تو اس کی والدہ کی قدر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو ماں کی قدر گر جاتی ہے۔ دوران حمل بھی ایک حاملہ کو بارہا اس طرح کے خیالات سننے پڑتے ہیں کہ اس کے ہاں لڑکی ہوئی تو خاندان کو بہت کم خوشی بلکہ رنج ہو گا اور اگر لڑکا ہوا تو ہر فرد خوش ہو جائے گا۔ اس بات پر حیرت اور صدمہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے خیالات بعض پڑھے لکھے بلکہ تحریک کے افراد میں بھی پائے جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے لڑکیوں کی پیدائش کو ان کے والدین کے لیے نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے نہ کہ غم و افسوس کا۔

احادیث میں ہمارے ہاں کے مروجہ غلط تصور کی شدت سے تردید کی گئی ہے کہ لڑکے لڑکیوں سے افضل ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کی پیدائش کو حقیر جاننے پر وعید کی گئی ہے۔ دراصل ہمارے بہت سے معاشرتی تصورات اسلام سے پہلے کے ہندوانہ معاشرے اور زراعتی ثقافت پر مبنی ہیں جس میں لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے کو اثاثہ سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے دیہاتی علاقوں میں جہاں کاشتکاری بنیادی ذریعہ معاش ہے' خواتین مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں اور کمیت و کیفیت کے لحاظ سے ان کی کارکردگی میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا' اعزاز و اکرام کا حق دار مرد ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ ان گہرے ثقافتی معتقدات کو ٹھنڈے دل کے ساتھ تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور تحریکی افراد کو تو خالصتاً قرآن و حدیث کی بنیاد پر اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ کیا وہ اپنے دل و دماغ کو جاہلی رسومات سے آزاد کر سکے ہیں یا وہ بھی ان جاہلی تصورات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جن کو نبی کریمؐ نے اپنے پاؤں تلے روندا تھا۔

داعیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام جاہلی تصورات کے خلاف عملاً جہاد فرما کر ہمیں جس طرز عمل کی تعلیم دی ہے اس میں بیوی کے ساتھ حسن سلوک' محبت اور احترام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شخص کے اچھے اور برے ہونے کے لیے جو معیار بتایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کتنا اچھا ہے۔ محض اس بنا پر اپنی بیوی کو کم تر سمجھنا کہ وہ ایک یا زائد بیٹیوں کی ماں ہے' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کو رد کرتے ہوئے اپنے نفس کو اپنا رہنما بنانا ہے۔

ایک لمحے کے لیے اس مسئلے کے طبی پہلو پر بھی نظر ڈال لیجیے۔ ہماری طبی معلومات کی حد تک اگر رحم مادر میں تخلیقی مادہ کے امتزاج کے نتیجہ میں (X) کروموسوم بنیاد بنتا ہے تو لڑکی کی ولادت ہوتی ہے اور اگر (Y) کروموسوم بنتا ہے تو لڑکے کی ولادت ہوتی ہے اور اس خلیے کی ترکیب میں' ہونے والی ماں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس پر نہ اس کا اختیار ہے نہ شوہر نامدار کا۔ اگر ذمہ داری ہے تو دونوں کی اور اگر نہیں ہے

تو دونوں میں سے کوئی بھی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردہ ایک تناسب ہے۔ انسانی کوشش اور سائنسی تحقیق کے دعوے کے باوجود قرآن و حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جس جان کو جس شکل میں دنیا میں آنا ہے اس کا فیصلہ نہ والدین کرتے ہیں نہ طبی مشیر' بلکہ صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہ فیصلہ فرماتے ہیں۔

کسی شوہر کا اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کرنا نہ عقلی طور پر اور نہ اسلامی طور پر قابل قبول ہے۔ اس لیے جو حضرات اپنے گھر میں لڑکیوں کی پیدائش پر برہم اور مغموم ہوتے ہیں' انھیں فوری طور پر اپنے ایمان کا جائزہ لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے جس برکت اور فضل کا فیصلہ کیا گیا ہو اس پر نہ صرف قناعت بلکہ خوشی کا اظہار ایک دینی تقاضے اور مطالبے کے طور پر کرنا چاہیے۔

دراصل ہم ابھی جاہلی مرد آمیز (Male Chauvanist) ثقافت میں گرفتار ہیں۔ لڑکوں کی پیدائش پر پٹاخے چھٹتے ہیں' خوشیاں منتی ہیں' مٹھائی بٹتی ہے' باچھیں کھلتی ہیں اور لڑکیوں کی پیدائش پر خوشی پر اوس پڑ جاتی ہے۔ کیا یہی سید الانبیاءؐ سے محبت' اطاعت اور قربت کی علامت ہے؟ کیا یہی وہ عقلی رویہ ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ اس دور میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے ہیں' انھیں تو اپنے گھروں میں بہترین نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ ان کے رویوں کو جاہلی تصورات سے بالکل آزاد اور اسلام کی حقیقی تعلیمات کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ جو اپنے گھر میں' اپنی رفیقہ حیات کو بیٹی پیدا ہونے پر مجرم قرار دے سکتا ہے' وہ کس منہ سے کسی کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کرتا ہے اور کس منہ سے اللہ کے سامنے جائے گا۔ اسے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے اور اپنی اصلاح کرنا اور اللہ سے استغفار کرنا چاہیے۔

(ڈاکٹر انیس احمد)

گناہ گار مومن اور "نیکوکار" کافر کا فرق

میری ایک مسیحی شاگرد کہتی ہے کہ میں نے میٹرک میں اسلامیات کے کورس میں ایک حدیث پڑھی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمان چاہے کتنا ہی بڑا گنہگار ہو وہ کچھ عرصہ دوزخ میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر آخرکار ضرور جنت میں چلا جائے گا۔ مگر کافر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔ پھر وہ کہنے لگی آپ ہمیں بھی کافر ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی عیسائی خواہ وہ کتنا ہی نیکوکار ہو مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق دوزخ ہی میں جائے گا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

آپ اپنی شاگرد کو پہلے یہ بات سمجھائیں کہ گناہ گار مومن اور نیکوکار کافر کے درمیان فرق کی بنیاد کیا ہے۔ مومن اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری قبول کر کے اس کے وفادار بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنی اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے وہ کسی جرم یا بعض جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اس کے برعکس کافر

دراصل ایک باغی ہوتا ہے اور آپ کے کہنے کے مطابق اگر وہ نیکوکار ہو بھی تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس نے بغاوت کے جرم پر کسی اور جرم کا اضافہ نہیں کیا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص باغی ہے اور صرف مجرم ہے اسے صرف جرم کی حد تک سزا دی جائے گی' بغاوت کی سزا اس کو نہیں دی جا سکتی' کیونکہ جرم کرنے کی وجہ سے کوئی شخص وفادار رعیت کے زمرے سے خارج نہیں ہو جاتا۔ لیکن بغاوت بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے' اس کے ساتھ اگر کوئی شخص دوسرے جرائم کا اضافہ بھی کرتا ہو تو اسے وہ حیثیت کسی طرح نہیں دی جا سکتی جو وفادار رعیت کو دی جاتی ہے۔ وہ بغاوت کی سزا بہرحال پا کر رہے گا خواہ وہ اس کے علاوہ کسی جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن اگر وہ باغی ہونے کے ساتھ کچھ جرائم کا مرتکب بھی ہو تو اسے بغاوت کی سزا کے ساتھ ان دوسرے جرائم کی سزا بھی دی جائے گی۔

اس اصولی بات کو جب وہ سمجھ لیں تو ان کو بتایئے کہ اللہ تعالیٰ کی وفادار و فرمانبردار رعیت میں صرف وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو کسی قسم کے شرک کی آمیزش کے بغیر اور اللہ کے سب پیغمبروں کو کسی استثنا کے بغیر' اور اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کسی کا انکار کیے بغیر مانتے ہوں اور آخرت کی جواب دہی کو بھی تسلیم کرتے ہوں۔ ان میں سے جس چیز کو بھی آدمی نہ مانے گا وہ باغی ہو گا اور اسے خدا کی وفادار رعیت میں شمار نہ کیا جا سکے گا۔ اب مثال کے طور پر رسولوں اور کتابوں ہی کے معاملے کو لے لیجیے ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی انجیل کو جب یہودیوں نے نہ مانا تو وہ سب باغی ہو گئے' اگرچہ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے انبیا اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو وہ مانتے تھے۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے تک حضرت عیسیٰؑ کے پیرو اللہ کی وفادار رعیت تھے لیکن جب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا تو وہ بھی باغی ہو گئے۔ مسیحؑ اور انجیل اور سابق انبیا اور ان کی کتابوں کو ماننے کے باوجود وہ اللہ کی وفادار رعیت میں شمار نہیں ہو سکتے۔

یہ بات بھی جب وہ سمجھ لیں تو انھیں بتایئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت باغیوں کے لیے نہیں بنائی ہے بلکہ اپنی وفادار و فرمانبردار رعیت کے لیے بنائی ہے۔ اس وفادار رعیت میں سے اگر کوئی شخص کوئی ناقابل معافی جرم کرتا ہے یا اس نوعیت کے بہت سے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اسے اس کے جرائم کے مطابق سزا دی جائے گی اور جب وہ اپنی سزا بھگت لے گا تو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ لیکن جس نے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے وہ کسی طرح جنت میں نہیں جا سکتا۔ اس کا مقام بہرحال دوزخ ہے۔ دوسرے کسی جرم کا وہ مرتکب نہ بھی ہو تو بغاوت بجائے خود اتنا بڑا جرم ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی بھی اسے جنت میں نہیں پہنچا سکتی۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی' ترجمان القرآن' اگست ۱۹۷۵ء)

دعا کے لیے وسیلہ

اگر اپنی دعا کی قبولیت کے لیے وفات یافتہ بزرگوں سے وسیلہ لینا قرآن و سنت سے ثابت ہوتا تو حضرت عمرؓ دعائے استسقا میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ کو وسیلہ نہ بناتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زندگی میں ہر ایک کو عمل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ مرنے کے ساتھ ہی یہ موقع ختم ہو جاتا ہے۔ نہ کسی کے لیے دعا کر سکتا ہے اور نہ بددعا۔ دوسرے' کسی کی حرمت و تقدس کے وسیلے سے دعا مانگنے سے خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کے فیاض حقیقی ہونے کے بارے میں بدگمانی کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ وہ ازخود اور براہ راست عطا و بخشش نہیں کرتا۔ البتہ اگر اس کو کسی مقدس ہستی کا وسیلہ یا اس کی حرمت کا واسطہ دیا جائے تو پھر وہ اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

آپ وسیلہ بنانے کے یہ معنی لے رہے ہیں کہ جس کو وسیلہ بنایا جا رہا ہے' وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی سفارش کرتا ہے' اس سے دعا کرتا ہے' یا اس کے فیصلے پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں ایسا عقیدہ ہے' تو وسیلہ بنانا یقیناً صحیح نہیں۔ لیکن اگر ایسا کوئی عقیدہ نہیں' تو میرے نزدیک حضورؐ کا یا کسی اور کا واسطہ دینے میں کوئی غلطی نہیں۔

پھر آپ کا اعتراض یہ ہے کہ وسیلہ بنانے سے اللہ کے فیاض حقیقی ہونے کے بارے میں بدگمانی لازم آتی ہے کہ وہ ازخود عطا نہیں کرتا بلکہ مروت کا واسطہ دیا جائے تو اس کا دروازہ کھلتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو وہی ہے جو اوپر عرض کی ہے۔ اگر کسی کا یہ عقیدہ ہے تو صحیح نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ بات لازم آتی ہے' تو پھر مردہ کا واسطہ دیا جائے یا زندہ کا' انسان کا دیا جائے یا اپنے نیک عمل کا' یا خود اپنے حق کا' دعا کے لیے کوئی مخصوص وقت یا جگہ کا انتخاب کیا جائے' یا کسی نیک آدمی سے دعا کرائی جائے' سب پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ نیک عمل کا واسطہ دینا' اس حدیث سے ثابت ہے جس میں تین افراد کے' جو غار میں بند ہو گئے تھے' دعا مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخر کیا ضرورت تھی کہ اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے اعمال کا واسطہ دیا جائے' کیا وہ ازخود متوجہ نہیں ہو سکتی تھی؟ اور یہ اعمال تو اس کے علم میں تھے ہی۔ اسی طرح حضرت عباسؓ کے واسطے سے استسقا پر بھی یہی اعتراض وارد ہو گا۔

حضرت عباسؓ کا واسطہ دینے سے یہ استدلال کرنا کہ وفات یافتہ بزرگ کا واسطہ نہیں دیا جا سکتا' صحیح نہیں۔ ایک کام کو ایک طرح کرنے سے' اور ہر طرح کرنا ازخود ممنوع نہیں ہو جاتا۔ مسنون دعاؤں میں "بحق" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں' اور اسی طرح کا لفظ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے استعمال کیا ہے۔

یہ بھی غور فرمائیں کہ آج جب کہ ایمان و اسلام معرض خطر میں ہیں' ان جزئی اختلافی مسائل میں اپنا وقت صرف کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ (خرم مراد' ۹۶)

RS. 150/= Only

سمع وبصری پیشکش

ویڈیو میگزین اسپیشل ایڈیشن

منظر پس منظر

سالنامہ 1997ء

ویڈیو نیوز میگزین

★ قوم کا مطالبہ احتساب اور جماعت اسلامی کی عملی جدوجہد

★ نواز شریف حکومت کا ایک سال ---- تنقیدی جائزہ

ساری قوم کا ایک ہی نعرہ "احتساب احتساب"

سید منور حسن، ایس ایم ظفر، ایچ ایم انصاری، لیاقت بلوچ اور ڈاکٹر مغیث الدین شیخ کے انٹرویو

★ تحریک احتساب کے سلسلہ میں وادی سوات بر تانی اور خیبر سے کراچی تک کے پروگرامات کی خصوصی رپورٹیں

★ ممبر سازی مہم کی رپورٹ

★ جوش وجذبے سے بھرپور اور ولولہ انگیز انقلابی ترانے

★ جہاد کشمیر اور مجاہدین کشمیر سے اظہار یکجہتی

★ غیر جانبدارانہ اور بے لاگ تبصرے

★ ہاتھوں کی زنجیر، عظمت جہاد کانفرنس اور دیگر پروگرامات کی خصوصی رپورٹیں

SUPPLEMENT

★ دورہ بنگلہ دیش امیر جماعت اسلامی پاکستان

★ یوم یکجہتی کشمیر 5 فروری

★ احتساب کارواں پہلا مرحلہ امیر جماعت کا اہم خطاب

★ دورہ سوڈان کی روداد لیاقت بلوچ

کراچی میں ہر تحریکی مکتبہ پر دستیاب ہے

Ph: 021-7787137

قریبی ایجنسی یا ہم سے رابطہ کریں

سمع وبصر لاہور

علی ہائیٹس کریم بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

فون: 5411546
فیکس: 5419541

تفسیر فی ظلال القرآن

ترجمہ سید معروف شاہ شیرازی

جلد اول تا ششم مکمل سیٹ

ھدیہ - 2125 روپے

آج ہی قریبی بک سنٹر سے طلب فرمائیں۔

سائز 23x33/8 کاغذ فلائنگ 55 گرام کل صفحات 7000

ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ p.o اعوان ٹاؤن لاہور ۔ فون 446479

کتاب نما

مکتوبات مودودی مرتبہ: پروفیسر اشرف بخاری۔ ناشر: یونی ورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار پشاور۔ ط دوم: صفحات ۱۹۰۔ قیمت: ۶۶ روپے۔

مولانا مودودی کے مکاتیب، رنگینیِ کلام کے بجائے حیات افروز دینی و عمرانی مسائل و معارف کا خزینہ ہیں، جن کا اسلوب سادہ و دل نشیں ہے۔

بقول محمد صلاح الدین مرحوم: "مولانا مودودی کو جس دور میں دین کی مدافعت و سربلندی کا کام انجام دینا پڑا، اس میں ایک طرف نوآبادیاتی تسلط، اور اس کے زیر اثر مغربی تہذیب اور اس کے افکار و نظریات کا محاذ تھا تو دوسری طرف خود مسلمانوں کے اندر ایک گروہ مغربی نظریات کا مبلغ بن چکا تھا۔۔۔ اسلامی ریاست اور عہد جدید میں اس کے نظام حکومت کی بحثیں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد اس مملکت میں نظریاتی الجھاؤ کی کوششوں نے ایک نیا میدان عمل کھولا۔ حکومت کی سطح پر دستوری مسائل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔۔۔ زندگی کے تمام اجتماعی مسائل سے تعلق رکھنے والے ہزاروں خطوط کے جوابات مولانا مودودی نے دیے۔ اسلام کو چیلنج کرنے والا کوئی نظریہ، کوئی فکر، کوئی فرد، کوئی گروہ ایسا نہیں، جس کو مولانا مودودی کے قلم نے اپنی زد میں لیے بغیر چھوڑ دیا ہو۔ ان کا کام اپنے حجم، اپنی ہمہ گیری، اپنے تنوع اور اپنے اثرات کے لحاظ سے فقید المثال ہے" (دیباچہ، ص ۸، ۹)۔ اسی نوعیت کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں خطوط، مولانا مرحوم اپنے علمی ورثے میں چھوڑ کر گئے ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعے میں مرتب نے موجودہ صوبہ سرحد کے رفقا کے نام، مولانا کے خطوط کو جمع کر دیا ہے۔ یہ ایک ابتدائی مگر کامیاب کوشش ہے۔ کتاب کے آخر میں بعض حوالوں سے مختصر حواشی بھی دیے گئے ہیں، لیکن بہت سے نکات تشنہ توضیح رہ گئے ہیں۔ اگر مکتوب کے عکس بھی دیے جاتے تو اچھا تھا، کیونکہ خطوط کو نقل کرتے وقت غلطی کا امکان رہتا ہے۔ پروف کی جو غلطیاں طبع اول (۱۹۸۳) میں رہ گئی تھیں، مرتب نے موجودہ طبع دوم میں بھی، انھیں باقی رہنے دیا ہے۔ حالانکہ کسی متن کو مرتب کرتے وقت اس کی صحت کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔

یہ کتاب اس اعتبار سے ایک اچھی مثال ہے کہ دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو اپنے علاقوں میں اس طرح

کے علمی نوادر جمع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے' تاہم ایسی چیزوں کی ترتیب و تدوین میں ریاضت اور محنت کا دامن بہرحال ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ (سلیم منصور خالد)

اسلام کا تصور جرم و سزا ' مرتب: خورشید احمد ندیم۔ ناشر: عالمی ادارہ فکر اسلامی' ۲۸ مین روڈ' ایف ۱۰-۲' اسلام آباد۔ صفحات: جلد اول ۵۳۲' جلد دوم ۳۹۰۔ قیمت: درج نہیں۔

عالمی ادارہ فکر اسلامی نے علوم اسلامیہ کی تشکیل جدید کے سلسلے میں نمایاں کام کیا ہے۔ بالخصوص اجتماعی علوم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ' امت مسلمہ کے علمی' تہذیبی اور تمدنی تشخص کی تلاش اور بحالی بھی اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ ادارہ عربی' انگریزی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں متعدد کتب و مقالات شائع کر چکا ہے۔ اب اس کی پاکستانی شاخ نے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کی نگرانی میں' اردو تراجم کا بھی آغاز کر دیا ہے اور "معاصر اسلامی فکر" کے عنوان کے تحت مختلف موضوعات پر مختلف علوم کے ماہرین کی تحقیقات کو مربوط انداز میں یکجا کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب **اسلام کا تصور جرم و سزا** پاکستانی علما اور ماہرین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۷ کے بعد نظام اسلامی کے عملی نفاذ کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھے گئے۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری بتاتے ہیں کہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ریاست کی سطح پر نفاذ اسلام کی مہم شروع کی تو اس کے نتیجے میں حدود و تعزیرات اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے شعبوں میں ہمارے اہل علم نے بہت سی اہم اور قابل قدر چیزیں لکھیں جن کا مطالعہ دینی پہلو سے معاملات کے فہم میں مفید ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں علمی روایت کس طرح آگے بڑھ رہی ہے۔ زیر نظر کتاب میں اسلام کے تصور جرم و سزا سے متعلق متعدد اہم تحریروں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ جلد اول کے مقدمے میں مولف نے نصف صدی پر محیط اس علمی کام کا ایک جائزہ پیش کیا ہے جو تفسیر' حدیث اور فقہ پر سامنے آیا ہے۔ مباحث کا اندازہ عنوانات سے ہو سکے گا: اسلامی سزاؤں کی حکمت اور فلسفہ' قتل کی سزا' ارتداد کی سزا' قید کی سزا اور موت کی سزا۔ دوسری جلد رجم کی سزا سے متعلق مباحث کے لیے مختص ہے۔

لکھنے والوں میں مولانا امین احسن اصلاحی' مفتی ولی حسن' مولانا محمد تقی عثمانی' مولانا عمر احمد عثمانی' مولانا احمد سعید کاظمی' مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور جاوید احمد غامدی جیسے علما اور محققین شامل ہیں۔ مرتب نے اہل علم کے مختلف نقطہ ہائے نظر کو بلاکم و کاست پیش کر دیا ہے۔

کتاب کی تدوین اور ابواب بندی کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت تھی۔ فصول کے تحت ابواب بندی محل نظر ہے۔ معروف صورت اس کے برعکس ہے۔ مقالات مختلف رسائل اور کتب سے اخذ کیے گئے ہیں مگر

حوالے مکمل نہیں ہیں۔ قرآنی آیات پر اعراب نہ دینا' ایک بڑی فروگذاشت ہے۔ بعض عنوانات مبہم ہیں جیسے "بنیادی اصول"۔ جلد اول کی فہرست میں عنوانات مباحث کے ساتھ' لکھنے والوں کے نام بھی دینا مناسب تھا۔ پروف خوانی مزید توجہ طلب ہے۔ امید ہے ادارہ اس طرح کے علمی مجموعہ مقالات کو دل جمعی و توجہ سے مزید بہتر تدوین کے ساتھ' قارئین تک پہنچانے کی مبارک سعی جاری رکھے گا۔ (حافظ محمد سجاد)

اثر التشیع علی الروایات التاریخیة فی القرن الاول الهجری [پہلی صدی ہجری میں تاریخی روایات پر شیعی اثر]' ڈاکٹر عبدالعزیز محمد نورولی۔ ناشر: دارالتحصیری للنشر والتوزیع' مدینة منورة۔ صفحات: ۴۰۷۔ قیمت: درج نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی معرکہ آرا تصنیف سیرة النبیؐ کے مقدمے میں کہا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں تاریخ اسلام میں واقعات و حوادث کا اندراج جس انداز سے ہوا ہے' اس میں تحقیق کے اصولوں سے تساہل برتا گیا ہے۔ خود شبلی نے سیرت میں' تاریخ کے بجائے حدیث کو' سیرت میں بنیادی اہمیت دی ہے مگر ان کے اس نکتے پر دیگر مسلم مورخین نے عرصے تک توجہ نہیں دی۔ چنانچہ ہمارے ہاں تاریخ کے نام سے جو کتابیں منظرعام پر آئی ہیں' زیادہ تر یہ تاریخ کے بجائے داستان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں رطب و یابس کی اتنی بہتات ہے کہ عام قاری صحیح اور غلط میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں پہلی صدی ہجری سے متعلق (جو خیرالقرون میں سے ہے) اور اس دور کے مسلمان صحابہ و تابعین' امت کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ کی بعض کتابوں میں جو واقعات ملتے ہیں ان سے ان بابرکت شخصیات کے بارے میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ حالانکہ ان شخصیات کے جنتی ہونے کی بشارت خود قرآن نے ان کی زندگی ہی میں دی تھی۔ عام قاری انھیں پڑھنے کے بعد محسوس کرنے لگتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے خدانخواستہ ان میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ان میں بھی وہی اخلاقی و اجتماعی خرابیاں پائی جاتی تھیں' جو آج کے دور میں پائی جاتی ہیں۔ یہ صورت حال قریب قریب ان یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح ہے جنھوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں ان معصوم انبیا کی زندگیوں کو داغدار بنا کر انھیں اسوۂ حسنہ نہیں بننے دیا۔

اس سلسلے میں گذشتہ چند سالوں میں دنیاے عرب میں معیاری کام سامنے آیا ہے' جس میں تاریخی روایات کو علم رجال کے تحقیقی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔

شامی عالم ڈاکٹر نور الدین عتر' کی مقبول عام کتاب' منهج النقد میں علم حدیث و تاریخ کے اصولوں کو شانہ بشانہ لے کر چلنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس سلسلے کا اہم کام وہ تحقیقی مقالے ہیں جو

ڈاکٹریٹ اور ایم فل کے طلبہ نے مشہور عراقی محقق ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری اور بعض دیگر اساتذہ کی زیر سرپرستی مدینہ یونی ورسٹی اور بعض دیگر یونی ورسٹیوں میں تیار کیے۔

زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سنہرے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو ایک ہندی نژاد سعودی طالب علم ڈاکٹر عبدالعزیز نوربلی نے مدینہ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے لیے' ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری اور ڈاکٹر سعدی الہاشمی کی زیر سرپرستی تیار کیا۔ اس مقالے کا موضوع قرن اول کے واقعات سے متعلق تاریخی روایات میں شیعی اثر کو اجاگر کرنا اور جن شخصیات پر خواہ مخواہ تشیع کا الزام دھرا گیا ہے' ان کی حقیقت واضح کرنا ہے۔

کتاب کے مباحث اس طرح ہیں: شیعیت کی ابتدا اور ان کے بنیادی عقائد' غالی شیعہ راویوں کا تذکرہ۔ بعض ایسے راویوں کا ذکر (جن پر خواہ مخواہ شیعہ ہونے کی تہمت لگائی گئی) اسی طرح بعض اہل سنت (جن پر شیعیت کا جھوٹا الزام لگایا گیا) اور شیعہ مورخین کا تذکرہ اور عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ کے واقعات و روایات میں شیعی اثرات (ان میں سے اہم ترین واقعات یہ ہیں: حضرت ابوبکرؓ کی خلافت' غدیر خم' سقیفہ اور بیعت حضرت ابوبکرؓ' حضرت اسامہؓ کی فوج کی روانگی' ارتداد' حضرت عثمانؓ کا بحیثیت خلیفہ انتخاب' شہادت حضرت عثمانؓ' بیعت حضرت علیؓ' واقعہ جمل' جنگ صفین اور ثالثی کا واقعہ' جنگ نہروان)۔ خلافت امویہ میں پیش آنے والے واقعات کی روایات میں شیعی اثر کا جائزہ۔ (اہم وقعات: خلافت حضرت معاویہؓ و یزید' حضرت حسنؓ کی وفات' حضرت حجر بن عدی کا قتل' واقعہ کربلا و شہادت حسینؓ' واقعہ حرۃ اور محاصرہ مکہ' کعبے پر منجنیق سے حملہ' مرج رھط' توابین مختار ثقفی' حضرت مصعب بن زبیرؓ' عبداللہ بن زبیرؓ اور عبدالرحمٰن بن اشعث کی بغاوتیں وغیرہ)۔

اردو زبان میں جذباتی اور مناظراتی لٹریچر کی کمی نہیں ہے۔ عربی سے اردو میں تراجم بھی خوب آ رہے ہیں لیکن تحقیقی اسلوب دینے والی کتابیں شاذ و نادر ہی ترجمہ ہو کر آتی ہیں۔ کاش تحقیقی کتابوں کی طرف بھی ہمارے مترجمین کی نگاہیں جائیں تاکہ ہماری سوچ کا معیار بلند ہو۔ یہ کتاب تاریخ کے میدان میں قابل ذکر خدمت ہے۔ (عبدالمتین منیری)

Islam in The Balkans [اسلام' بلقان میں] مدیر: ظفر اسحاق انصاری۔ ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی' پوسٹ بکس ۱۰۳۵' اسلام آباد۔ صفحات: ۵۸۰۔ قیمت: درج نہیں۔

۱۹۹۲ میں جب بوسنیا ہرزے گووینا یورپ کے سیاسی نقشے پر ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے ابھرا تو مسلمانان عالم کی توجہ جنوب مشرقی یورپ کے علاقے میں مسلم تہذیب و تمدن کے اس مرکز کی طرف ہوئی۔

اس سے قبل بلقان کی طرف ہندی مسلمانوں کی توجہ علامہ اقبالؒ کی نظموں کے ذریعے مبذول ہوئی تھی اور ریاستوں کے حصے بخرے ہونے کے عمل کے لیے انگریزی زبان میں بلقانائی زیشن (Balkanisation) کا محاورہ بن گیا تھا۔ اب یوگوسلاویہ ٹوٹنے کے نتیجے میں ماضی کی یہ مسلم ریاست وجود میں آئی تو مغربی طاقتوں کو ایک آنکھ نہ بھایا کہ یورپ کے قلب میں یہ زندہ رہے۔ چنانچہ حقوق' جمہوریت اور رواداری کے سب سبق بھول کر برطانیہ' جرمنی' فرانس' روس اور امریکہ کی سرپرستی میں قتل و غارت' خونریزی اور مظالم کے ایسے ایسے واقعات ساری دنیا نے دیکھے کہ الامان والحفیظ۔ سلام ہے بوسنیا کے مسلمانوں پر کہ انھوں نے آگ اور خون کے دریا سے گزر کر بھی اپنی آزادی کا دفاع کیا۔

ادارہ تحقیقات اسلامی نے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کی راہنمائی میں مسلم تہذیبوں کے مراکز کے مطالعے کے سلسلے میں (اندلس ۱۹۹۰' وسط ایشیا ۱۹۹۴) سرکاری اداروں کی روایت سے ہٹ کر' ۲ سال کی محنت کے نتیجے میں بلقان پر ایک غیر معمولی وقیع' تحقیقی کاوش پیش کی ہے۔ یہ ادارے کے تحقیقی مجلے Islamic Studies کا ایک خصوصی شمارہ ہے' جس میں اس علاقے کے تاریخی پس منظر' سیاسی' مذہبی' معاشی' تعلیمی اور ادبی صورت حال اور بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے مستقبل کے امکانات کا نہایت گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ بوسنیا کے دو نامور اہل علم اسماعیل بالک (Ismail Balic) اور انتونیزوک (Anto Knezvik) نے مہمان مدیر کی حیثیت سے کام کیا ہے اور خود مقالات لکھنے کے علاوہ اس شمارہ خاص کی منصوبہ بندی اور ادارت میں مسلسل شریک رہے ہیں۔ ۲۲ مقالات کی اس کہکشاں میں ہر ستارہ ہی اپنی آب و تاب رکھتا ہے مگر ہمارے قارئین کے لیے لکھنے والوں میں ایک معروف نام عطاء اللہ گوپانسکی کا ہے' جن کا مضمون البانیہ پر ہے۔ چند مقالات فرانسیسی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ سولھویں سے اٹھارھویں صدی تک بلقان کے کلچر پر پپاوک (Papavic) کے مقالے میں اس دور کی شاعری کی جھلکیاں اور اس طرح کے قصے کہانیاں ہیں جو مسلمانوں کا مشترک سرمایہ ہیں اور بہت لطف دیتی ہیں۔ اس مقالے میں دور عروج کی علمی سرگرمیاں' تعمیرات اور خطاطی' کیا کچھ نہیں ہے۔ ایک مقالے میں ایک تحریک تصوف کا تذکرہ ہے۔ ایک تفسیر قرآن پر ہے۔ ایک میں سربیا کی اسلام دشمن پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ایک میں نئے ورلڈ آرڈر میں نسل کشی کی سیاست کا بیان ہے۔ عثمانیوں کے نظام تعلیم پر ۴۶ صفحات کا نہایت قیمتی مقالہ ہے۔ عزت بیگووچ کی کتاب کا مطالعہ ہے اور اس کے علاوہ متعدد دیگر مقالات! سچ یہ ہے کہ بلقان کے مسلمانوں نے اسلامی ریاست کا خوب تحفظ کیا ہے اور اسلامی تہذیب کے ارتقا اور اسلامی فکر کی نشوونما میں نہایت بھرپور اور وقیع حصہ لیا ہے۔

تبصرہ نگار سوچ رہا ہے کہ اس قیمتی کاوش کو پڑھنے والے ہمارے ملک میں کتنے ہوں گے؟ یقیناً بیرون

ملک تحقیقی اداروں میں اس کی قدر ہو گی لیکن ہمارے کتنے اساتذہ، کتنے طلبہ، کتنے اہل علم بوسنیا پر ٹی وی خبریں اور اخبارات میں سرخیاں دیکھنے سے زیادہ کی فرصت رکھتے ہیں؟ ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں کھیل تماشوں کے بجائے، علمی سرگرمیوں کے کلچر کو فروغ دیا جائے۔ عروج اور ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہمارے نوجوان اور بزرگ مطالعے کا ذوق پیدا کریں اور معاشرے میں علم و تحقیق کی قدر و منزلت ہو۔

(مسلم سجاد)

خرم مرادؒ حیات و خدمات: ترتیب و ادارت: مسلم سجاد، سلیم منصور خالد، حسن صہیب مراد، مظفر بیگ۔ ناشر: منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات: ۵۰۰۔ قیمت اعلیٰ مجلد: ۲۰۰ روپے، پیپر بیک: ۱۰۰ روپے۔

قیام پاکستان کے بعد تحریک اسلامی کو نئی نسل کے جو لوگ ہاتھ آئے، ان میں خرم مراد کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ ۱۹۴۸ میں اسلامی جمعیت طلبہ سے منسلک ہوئے اور جلد ہی اپنی ذہانت، صلاحیت اور دین سے لگاؤ کی بنا پر تحریک کے قائدین کی صف میں پہنچ گئے۔ دسمبر ۹۶ میں قلب کے آپریشن کے دوران ان کا انتقال ہو گیا۔ زیر نظر مجموعہ ان کے بھائی اور رفیق کار مسلم سجاد کی سربراہی میں ایک ٹیم نے مرتب کیا ہے۔

خرم مراد نے ایک غیر معمولی زندگی گزاری۔ کہنے کو انھوں نے ۶۳ سال کی عمر پائی لیکن ۳۴ سال کی عمر میں وہ قلب کے مریض ہو گئے اور پھر باقی ۲۹، ۳۰ سال انھوں نے اس مرض کے ساتھ لڑتے ہوئے زندگی گزاری۔ اس مرض نے ان کے جسم کو اسیر کر لیا تھا، لیکن ان کی روح صحت مند اور آزاد تھی۔ اس بیماری کے ساتھ انھوں نے ایک سیاسی جماعت اور ایک علمی ادارے کی سربراہی کی۔ رسالے کی ادارت کی، بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں، انگریزی اور اردو میں کتابیں تصنیف کیں، اور ساتھ ہی ساتھ تحریک اسلامی کی متعدد ذمہ داریاں سنبھالیں۔ انھوں نے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے پیشے میں انتہائی بلندی پر پہنچے۔ انجینئر کی حیثیت سے بھی اور منتظم کی حیثیت سے بھی۔ یہ کام پوری توجہ چاہتا ہے۔ اس کے بعد کوئی شخص کسی اور کام کے لیے وقت نکالے، یہ بہت مشکل ہے لیکن خرم مراد نے تحریک اسلامی کی ذمہ داریاں اس طرح سنبھالیں کہ جیسے وہ یہ کام ہمہ وقتی طور پر کر رہے ہوں--- تیاری، غور و خوض اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ، اس منصوبہ بندی میں ان کی ذات بھی شامل تھی۔ انھوں نے اپنی کمزوریوں اور صلاحیتوں کا اندازہ لگایا، صلاحیتوں کو ابھارا اور کمزوریوں کی اصلاح کی۔ ان کی بعض ذاتی خصوصیات ایسی تھیں جنھیں معائب میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن انھوں نے ان کو حسنات میں بدل ڈالا۔ کتاب میں کئی جگہ ان کی "ضد" کا ذکر ہوا ہے لیکن اس "ضد" کو انھوں نے استقامت میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ اپنی بیماری کے باوجود انھوں نے انتہائی ہمت اور پامردی کے ساتھ معمول کی زندگی گزاری۔ اور اس سے کہیں زیادہ متحرک اور فعال رہے جتنا کہ

عام صحت مند آدمی ہوتا ہے۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ بیماری نے انھیں مضمحل اور دل شکستہ بنانے کی بجائے' ان کو مزید توانا اور فعال کر دیا' اس لحاظ سے کہ انھیں مستقل یہ احساس رہا کہ ان کے پاس بہت وقت نہیں ہے' لہٰذا جو کام کرنا ہے' اسے جلد از جلد نمٹا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کے کاموں پر نظر ڈالیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ اس قدر کام کیسے ممکن ہوا۔

اس کتاب میں جو پہلے ماہنامہ "آئین" کے ایک خاص نمبر کی حیثیت سے شائع ہوا تھا' چھوٹے بڑے تقریباً ساٹھ مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین خالص رسمی نوعیت کے ہیں' لیکن ساتھ ہی ساتھ بعض انتہائی پر اثر مضامین بھی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں تو ان کی رفیقہ حیات کا مضمون ہے' لیکن رئیسہ عزیز صاحبہ کا مضمون بھی بہت خوب ہے۔ ان دونوں تحریروں میں خرم مراد کی زندگی کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے' جو نجی زندگی کا حصہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر مخفی رہتے ہیں۔

حسن قاسم مراد کا مضمون سب سے ہٹ کر ہے' لیکن اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ حسن قاسم نہ صرف خرم مراد کے بھائی ہیں' بلکہ بعض معاملات میں ان سے مختلف آرا رکھتے ہیں جن کا اظہار انھوں نے نہایت ادب اور شائستگی سے کیا ہے۔

حسن قاسم کا مضمون اس لحاظ سے بھی نمایاں ہے کہ انھوں نے خرم مراد کی گہری تحریکی وابستگی کے ساتھ ساتھ ان فکری لہروں کا بھی ذکر کیا' جو عام لوگوں سے پوشیدہ رہیں۔

خرم مراد' پاکستان کی تحریک اسلامی میں اس لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتے تھے کہ انھوں نے تحریک کو کئی مختلف زاویوں سے دیکھا۔ وہ کراچی میں تحریک اسلامی کے ایک نوجوان کارکن کی حیثیت سے ابھرے اور پھر پورے پاکستان میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ ہوئے۔ پھر مغرب کا پہلا تجربہ حاصل کیا۔ جلد ہی وہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ گئے بھی تو اس طرح کہ اس خطے کو پوری طرح اپنا لیا۔

اس وقت جبکہ ملک میں عصبیت کی آگ بھڑک چکی تھی۔ ڈھاکہ میں جماعت اسلامی کے ارکان نے انھیں اپنا امیر بنا لیا۔ انھوں نے اس خطے میں رشتے داریاں بھی قائم کر لیں۔ واپس آکر وہ نسبتاً زیادہ عرصے کے لیے مغرب میں رہے اور پھر حتمی طور پر لاہور میں بس گئے۔ اس طرح انھیں تحریک اسلامی کو کم از کم چار اہم تناظر میں دیکھنے اور اس میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ میرے خیال میں یہ تجربہ کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ سوال ذہن میں ابھرا کہ خرم مراد جیسے ذہین لوگ جنھوں نے تحریک اسلامی کو ان مختلف تناظر اور مراحل میں دیکھا اور ہر موقع پر شریک کار رہے' وہ تحریک کی پالیسیوں کے بارے میں جو کچھ سوچتے تھے' وہ واضح طور پر کیوں سامنے نہیں آیا؟ اس بات کا ذکر کتاب میں کئی جگہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے سانحے سے پہلے ہی' ان کی فکر اس سلسلے میں بہت مختلف تھی۔ اسی طرح مارشل لا کے

زمانے میں حکومت سے تعاون کے بارے میں انھیں اختلاف رائے تھا کیا اچھا ہوتا کہ ان کے خیالات سامنے آتے' تاکہ تحریک کے کارکن اور اس کے ناقد دونوں اس سے فائدہ اٹھا سکتے۔

اس کتاب سے اگر رسمی نوعیت کی تحریریں نکال دی جائیں اور کم از کم پچاس صفحات خرم مراد کی منتخب تحریروں کے نمونے جمع کر دیے جائیں اور ان کی تحریروں کی ایک فہرست شامل کر دی جائے تو کتاب کی وقعت میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ موجودہ شکل میں بھی اس کتاب کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا' اور اس کے مرتبین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (ظفر آفاق انصاری)

حکیم ہمدرد اور تنہا مسافر' مرتبہ: شیر افضل بری کوٹی۔ ناشر: مرکز علوم اسلامیہ' راحت آباد' پشاور۔ صفحات: ۲۵۸۔ قیمت: ۸۰ روپے۔

حکیم محمد سعید کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے پاکستان اور اہل پاکستان کی اصلاح احوال کے لیے مختلف شعبوں میں جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں' وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اسی طرح مولانا راحت گل' صوبہ سرحد کی ایک معروف دینی اور علمی شخصیت ہیں۔ مرکز علوم اسلامیہ پشاور کے بانی ناظم' ایک درویش خدامست' جنھوں نے ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے زندگی بھر سعی پیہم جاری رکھی۔ وہ مولانا مودودیؒ کے قدردان اور جماعت اسلامی کے بہی خواہ اور موید ہیں۔ اپنے بقول: "جماعت اسلامی کے تنہا مسافر" (اس نام سے ان کی کتاب پر تبصرہ' دیکھیے: ترجمان القرآن نومبر ۱۹۹۶)۔ تنہا مسافر اور حکیم محمد سعید کے ایک مداح دوست شیر افضل خان بری کوٹی نے اپنے ممدوحین کا ایک دلچسپ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ سرورق کے فوراً ہی بعد "حکیم ہمدرد" اور "تنہا مسافر" کی رنگین و دلکش تصویریں' اس کے بعد مرتب کا طویل مقدمہ جس میں زیادہ تر حکیم صاحب کی زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز کوائف اور ان کی خدمات کی کچھ جھلکیاں۔ بعدہ' دونوں کی باہمی خط کتابت' وطن عزیز کی فلاح اور ترقی کے لیے مفید تجاویز پر مشتمل اول الذکر کی تقاریر' کچھ دانش وروں کے کلمات خیر اور آخر میں حکیم صاحب کی چند انگریزی تقاریر۔ تنہا مسافر کی نومبر ۹۵ کی ایک تقریر سے ایک مختصر اقتباس دیکھیے: "جب تک ہم خود غرض' ضمیر فروش' بے اصول اور منافق حکمرانوں کے چنگل سے آزاد نہیں ہوں گے' زوال کے گڑھے میں گرتے جائیں گے مگر اندھی قوم پھر بھی ان ڈاکوؤں اور لٹیروں کے زندہ باد کے نعرے لگا رہی ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔ آمین!" کتاب دلچسپ ہے اور معلومات افزا بھی۔ (رفیع الدین ہاشمی)

مدیر کے نام

افتخار احمد ملک، راولپنڈی

تعارف القرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے مبصر نے حضرت موسیٰؑ کے بارے میں لکنت بیان کو امر واقعہ کے طور پر تسلیم کر لیا ہے (مارچ ۹۸، ص ۷۵)۔ حالانکہ تفہیم القرآن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے واضح طور پر لکھا ہے: "فرعون کے اعتراض کی بنا کوئی لکنت نہ تھی جو آں حضرت کی زبان میں ہو بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص معلوم نہیں کیا بکی بکی باتیں کرتا ہے، مابدولت کی سمجھ میں تو کبھی اس کا مدعا آیا نہیں" (جلد چہارم، ص ۵۴۴)۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ہکلے یا توتلے آدمی کو اپنا رسول مقرر فرمائے۔ رسول ہمیشہ شکل صورت، شخصیت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بہترین لوگ ہوتے ہیں جن کے ظاہر و باطن کا ہر پہلو دلوں اور نگاہوں کو متاثر کرنے والا ہوتا تھا۔ کوئی رسول ایسے عیب کے ساتھ نہیں بھیجا اور نہیں بھیجا جا سکتا تھا جس کی بنا پر وہ لوگوں میں مضحکہ بن جائے یا حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے"۔ (جلد سوم، ص ۳۲)

ارشد سراج الدین، مکہ مکرمہ

مولانا امین احسن اصلاحی کی یاد میں (مارچ ۹۸) پڑھا۔ یقیناً مولانا مرحوم علمی لحاظ سے بیسویں صدی کے نابغہ روزگار شخصیات میں سے تھے۔ اردو کے دینی لٹریچر میں آپ کی کتاب دعوت دین اور اس کا طریق کار شاہکار حیثیت رکھتی ہے۔ جماعت کے متعلق ان کے انتہاپسندانہ موقف کے باوجود جماعتی حلقے میں بھی ان کے علم و فضل کی قدر کرتے ہیں۔ بہت ساری خوبیوں کے باوجود ان کی طبیعت میں انفرادیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مولانا فاروق خاں، مولانا مودودی کے انتقال پر لاہور گئے تھے۔ وہاں انھوں نے مولانا اصلاحی مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ان دنوں مولانا مرحوم کی سماعت کمزور تھی۔ شریک محفل کسی نے کہا کہ "مولانا کم سنتے ہیں"۔ اس جملے پر مولانا اصلاحی بول پڑے کہ جب میری سماعت درست تھی، تب بھی میں کہاں کسی کی سنتا تھا؟ طبیعت کی اسی انفرادیت نے مولانا کو تحریک اسلامی کے قافلہ سے الگ کر دیا۔

محمد اکمل گوہر، کھاریاں

میرے جیسے کم علم اور کم فہم لوگوں کو روز مرہ زندگی میں بے شمار جواب طلب مسائل پیش آتے رہتے ہیں لیکن معاشرے میں پھیلی ہوئی فرقہ بندیوں کی وجہ سے ان مسائل کا کوئی درست اور قلب و ذہن کو مطمئن کرنے والا حل جاننا نہایت مشکل ہے۔ "جرم و سزا اور توبہ استغفار" اور "غیر محرم کے

ساتھ ج" کے متعلق جو نہایت واضح اور مدلل جوابات دیے گئے ہیں (مارچ ۹۸) انھیں پڑھ کر بہت سی الجھنیں ختم ہو گئی ہیں۔

میاں محمد اکرم، لاہور

یقیناً وسائل کم نہیں پڑتے (مارچ ۹۸) اس لیے کہ انسانوں کے خالق رب العالمین نے، وسیع و عریض کائنات کو بے پایاں وسائل سے بھر دیا ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی اور احتیاجات میں انسانوں کے ساتھ، انسان اپنے فکر و عمل کی جولانیوں کی بدولت ان اتھاہ خزانوں سے اپنی ضروریات کا سامان مسلسل پاتا چلا آ رہا ہے۔ فطرت کبھی بخل نہیں کرتی، انسان ہی اپنی کج روی کے باعث معاشی پریشانیوں کا شکار رہتا ہے۔ اگر خالق کے بتائے ہوئے راستے پر چلا جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

غلام حسن بنگش، تھل

این جلوہ گاہ کیست بہت ہی اچھا لگا!

سلیم منصور خالد، گوجرانوالہ

دل چاہتا ہے کہ ترجمان میں کوئی عیب نہ ہو، کہیں انگلی نہ رکھی جا سکے لیکن آپ دل کی خواہش پوری نہ کرنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ معاہدہ لوسان لکھا ہے، لوزان درست ہے (ص ۴)۔ ٹی وی چینل ۱۷ کے بجائے ۴ ہونا چاہیے تھا (ص ۸)۔ چلی کے صدر کا نام الانوے نہیں، آلندے تھا (ص ۸)۔ مدینہ بجنور میں بجنور بھی نخ ہو گیا ہے۔ رسالے کا نام صرف مدینہ تھا (ص ۵۴) وغیرہ وغیرہ۔ تعارف القرآن پر اچھا تبصرہ ہے۔ مزید پھیلا کر مطالعہ کتب میں آ جاتا۔ قرآن کے حوالے سے کتب پر جامع محاکمہ ترجمان القرآن کی ذمہ داری ہے۔

ڈاکٹر ایچ بی خان، کراچی

ترجمان القرآن (فروری ۹۸) کے صفحہ ۸ پر قرارداد مقاصد کے منظور ہونے کی تاریخ ۷ مارچ ۱۹۴۹ تحریر کی گئی۔ لیاقت علی خاں مرحوم نے ۷ مارچ ۱۹۴۹ کو قرارداد مقاصد، دستور ساز اسمبلی میں پیش کی تھی، اور پانچ روز کی بحث کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ کو اسے منظور کیا گیا تھا۔

عبدالرقیب، مدراس، بھارت

معروف شاہ شیرازی کا "عہد رسالت میں" اسلامی ریاست کے بنیادی ادارے" خصوصی (جنوری ۹۸) بہت ہی عمدہ ہے۔ موصوف نے امام قرافی اور علامہ ابن شاط کے حوالے سے سیرت و سنت کے جن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، آج کے حالات میں بڑا ہی بصیرت افروز ہے۔ اگر وہ ابن شاط کی کتاب کا اردو ترجمہ فرما دیں تو یہ ملت اسلامیہ کے لیے گراں قدر تحفہ ہوگا اور بھارت جیسے کثیر العناصر معاشرے میں نبی کریمؐ کے احکامات پر عمل کے تعلق سے رہنمائی حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر طلعت سلطان، جدہ

الحمدللہ ترجمان آپ کی رہنمائی میں خرم بھائی کے دور کا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے۔ البتہ مسلم

بھائی کی موجودگی میں تعلیم اور خواتین سے متعلق مضامین میں اضافے کی جو توقع تھی' وہ ابھی تک خاطر خواہ طور پر پوری نہیں ہوئی۔

مسز عشرت انوار ' گلاسگو

ترجمان ایک بہت عمدہ اور مفید رسالہ ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت مختلف مسائل اور معلومات بہت اچھے طریقے سے بیان کیے جاتے ہیں لیکن اگر زبان کو مزید آسان کر دیا جائے تو کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے اسے سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ آج کل کے تیز رفتار زمانے میں لوگوں کو کسی بھی زبان پر عبور نہیں رہا۔ نیز فارسی کے الفاظ اور اشعار کے استعمال سے بھی احتراز کیا جائے تو بہتر ہے۔ ان کا ترجمہ ضرور دیا جائے۔ قرآن اور حدیث کے حوالے سے زندگی کے جس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی جائے وہاں آیات ربانی اور حدیث نبویؐ کا ترجمہ ضرور لکھا جائے۔ محترم خرم مراد مرحوم کی وصیت بے حد خوب صورت اور قیمتی سرمایہ ہے اور قرآن کریم کی ان آیات کا مجموعہ ہے جو عملی زندگی کے ہر لمحے کے لیے راہ ہدایت دکھاتی ہیں۔ اس کا ترجمہ انگلش زبان میں شائع کیا جائے۔

ترجمان کو پوسٹ کرنے کے لیے اگر پلاسٹک کی پیکنگ استعمال کی جائے تو بہتر ہے کیونکہ کاغذ کی عام پیکنگ عموماً بارش میں بھیگنے کی وجہ سے رسالے کے اکثر صفحات ضائع ہو جاتے ہیں۔

محمد اصغر ' واہ کینٹ

مجھے کسی رسالے کی اشاعت میں اتنی دقت نہیں ہوتی جتنی ترجمان میں' کیونکہ یہ ایک انتہائی بور قسم کا رسالہ ہے۔ جس کو ایک دفعہ دیتا ہوں وہ اگلی دفعہ انکار کر دیتا ہے کہ اس میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔

اعزاز الرحمٰن ملک' ٹچن آباد

۶۰ سال پہلے اور حکمت مودودیؒ کے لیے جو انتخاب آپ کرتے ہیں وہ موجودہ حالات پر بالکل منطبق ہوتے ہیں۔ مولانا علی میاں کی تفسیر سورۃ کہف سے انتخاب بروقت ہے (فروری ۹۸)۔ جدید تہذیب تمام وسائل پر مسلح ہو کر لوگوں کو ذہنی اور فکری ارتداد کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مولانا علی میاں نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ عصر حاضر کا مسئلہ مادی اور دنیاوی زندگی کی کشش ہے۔ جائز طریقے سے اگر مال جمع ہو تو تمام حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ان میں کوئی شرعی قباحت نہیں لیکن اسلامی انقلاب کے داعیان کو دنیا کی پہلی اسلامی تحریک اور اس کے قائد کے اسوہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ترجمان القرآن میں اس پہلو پر بار بار تذکیر ہونا چاہیے۔ مادی زندگی کی کشش ہی نے ہمارے علما' سیاست دانوں اور جرنیلوں کو کرپٹ کر دیا ہے۔ اصل مرض پر نگاہ رہنی چاہیے جیسا کہ ستمبر ۹۶ کے اشارات میں محترم خرم مرادؒ نے فرمایا ہے۔

ڈاکٹر سعد اللہ خان عابد ' ہاتھیان

اشارات اور حکمت مودودیؒ (مارچ ۹۸) دونوں اس قابل ہیں کہ ملک کے تمام اخبارات میں شائع ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مولانا مودودی نے آج کے حالات دیکھ کر لکھا ہو۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص حج کا ارادہ کرے اسے جلدی کرنی چاہیے کیونکہ ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے، ممکن ہے اونٹنی کھو جائے (یعنی سفر کے ذرائع مسدود ہو جائیں، راستہ پر خطر ہو جائے، سفر خرچ باقی نہ رہے) اور ممکن ہے کوئی ضرورت ایسی پیش آجائے جو سفر حج کو ناممکن بنا دے (لہٰذا جلدی کرو)۔ معلوم نہیں کیا افتاد پڑ جائے اور تم حج بیت اللہ سے محروم ہو جاؤ"۔ (ابن ماجہ)

شاندار مستقبل کی تعمیر کے لیے

ماہنامہ **ہمقدم** لاہور

مارچ 98ء کا پرچہ شائع ہو چکا ہے

- اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے نومنتخب ناظم اعلیٰ محترم حافظ نعیم الرحمٰن کا پہلا خطاب، مکمل متن
- سابق ناظم اعلیٰ جناب سید وقاص انجم جعفری کا آخری خطاب، مکمل متن
- سیشن 98-1997ء — جمعیت کا کام کیسا رہا؟ مکمل اور تفصیلی رپورٹ

ماہنامہ ہمقدم-1، اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

Ph: 7588488-7587124 ✪ Fax. 7572310

اہم گذارش: ترجمان القرآن میں اشتہار دینے والے اداروں یا افراد سے معاملات میں کوئی نقصان ہو تو ترجمان القرآن کے نمایندے اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ قارئین کو چاہیے کہ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے تحقیقات کریں اور اپنی ذمہ داری پر معاملہ کریں۔

SUN

گارمنٹس مینوفیکچررز متوجہ ہوں

ہم ❁ ہر قسم کے الاسٹک ❁ Woven لیبل اور ❁ لیس (Lace) تیار کرتے ہیں

برآمدکنندگان کے لئے معتبر نام

احمد لیس ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

آپ کی سہولت کے پیش نظر اب لاہور کے قلب میں

ایک نئے عزم کے ساتھ

اس پتے پر رجوع فرمائیں

13-A بلاک "S" گلبرگ II ' لاہور

فون : 5762967 ' فیکس : 042-5760086 موبائل : 0342 - 339463

---------------*---------------

فیکٹری D/94 شیر شاہ روڈ سائٹ کراچی

فون ۔ 2561019-2561018-2577950-2577949

2561021-2561020

فیکس 92-21-2414705-92-21-2563487

اللہ کے فضل و کرم سے

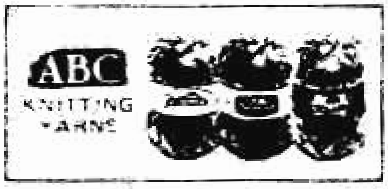
شناءاللہ نے جو چیز بنائی بہترین بنائی

شناءاللہ

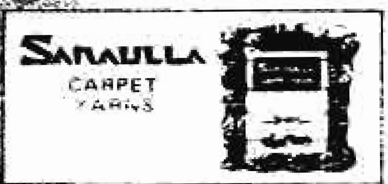
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے

شناءاللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ











تیسری منزل پینوراما سینٹر، فاطمہ جناح روڈ، کراچی۔ پاکستان۔

Phones: 516034 & 516035. Fax: 92-21-5681775.
Telex: 21699 SANA PK.

SUN

گارمنٹس مینوفیکچررز متوجہ ہوں

ہم ❀ ہر قسم کے الاسٹک ❀ Woven لیبل اور ❀ لیس (Lace) تیار کرتے ہیں

برآمد کنندگان کے لئے معتبر نام

احمد لیس ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

آپ کی سہولت کے پیش نظر اب لاہور کے قلب میں

ایک نئے عزم کے ساتھ

اس پتہ پر رجوع فرمائیں

A-13 بلاک "S" گلبرگ II ، لاہور

فون : 5762967 ، فیکس : 042-5760086 موبائل : 0342 - 339463

---------------*---

فیکٹری D/94 شیر شاہ روڈ سائٹ کراچی

فون.. 2561019-2561018-2577950-2577949

2561021-2561020

فیکس 92-21-2414705-92-21-2563487

جہاد کشمیر پڑھیے   جہاد میں شریک رہیے

جہاد کشمیر

بین الاقوامی معیار کا منفرد جریدہ

محاذ جہاد سے لمحے لمحے کی روداد

قائدین جہاد کے انٹرویوز

غازیوں کی داستانیں

شہیدوں کے روشن روشن تذکرے

کشمیر پر وہ سب کچھ جو آپ جاننا چاہتے ہیں

فی شمارہ 15 روپے
سالانہ زرتعاون (پاکستان) 250 روپے

الاکرام بلڈنگ مریڑ چوک، مری روڈ راولپنڈی فون: 504863 -554637
Internet: http://www.jihad-e-kashmir.org.pk
E-Mail: shams@isb.Comsats.net.pk



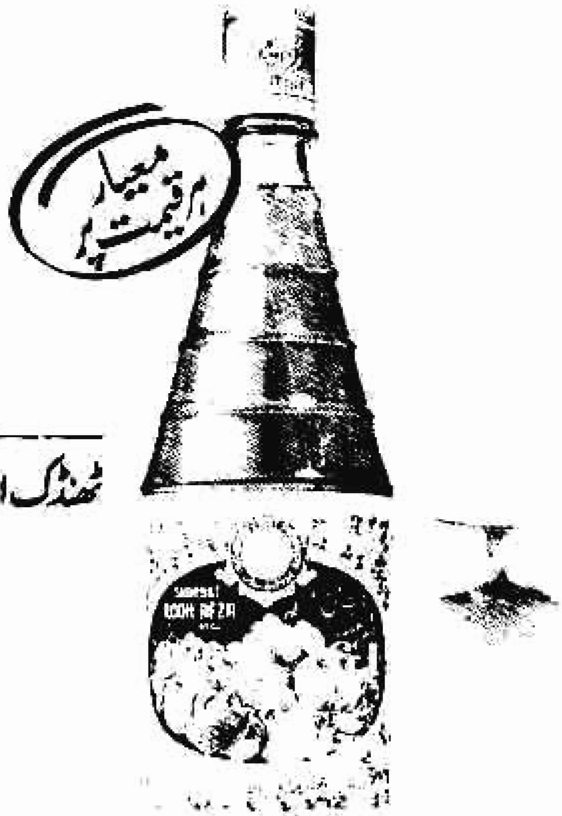
سین فاروق مودودی نے ملک عبد محمد پرنٹرز سے چھپواکر ۵-اے زیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

یہ جاننے کے لیے کہ
پچھلے نوّے سال سے زائد عرصے سے رُوح افزا
کروڑوں شائقین کا پسندیدہ مشروب کیوں ہے ،
آپ کو کسی تردّد کی ضرورت نہیں :

صرف

رُوح افزا

کا ایک گلاس نوشِ جاں کیجیے ۔



ٹھنڈک اور فرحت لیے تازگی بھرا ذائقہ

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

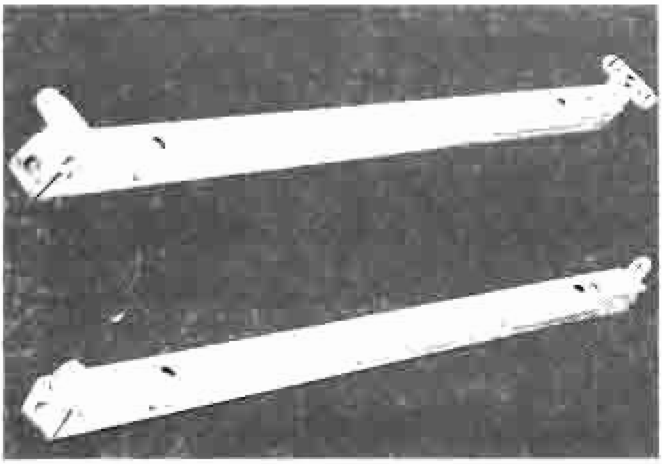
Adarts-HRA-8/97

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

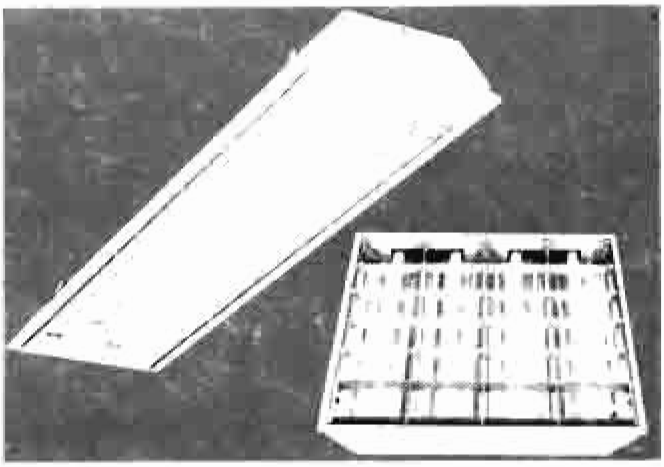
Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.

BATTEN LIGHT



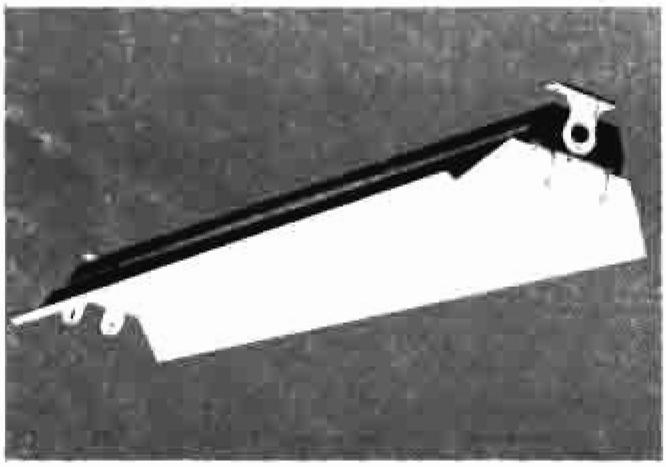
[illegible] slim shape [illegible] ballast tube light fixture for [illegible] rooms, [illegible] & drawing rooms etc.

OFFICE LIGHT



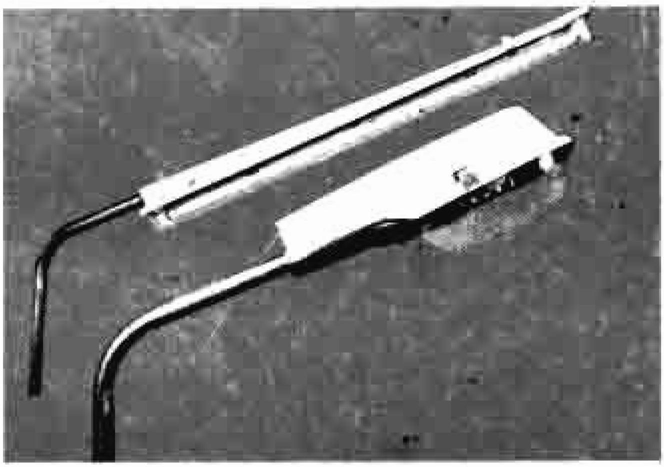
2x2 and 1x4 Recessed and surface fixture with beautiful aluminum louver for maximum and glare-free lighting

INDUSTRIAL LIGHT



[illegible] fixture with reflector for effective lighting and [illegible]

STREET/ROAD LIGHT



Most widely used for streets and roads lighting. Weather resistant and water proof fixtures.

PAKLITE
TUBE LIGHT FITTINGS

PAKLITE ELECTRICAL INDUSTRIES (PVT) LTD.
Sheikhupura Road, Gujranwala, Pakistan. Ph: 0431-272890-93 Fax: 0431-272894